www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

February 2006 • No. 351

پختگی نام ہے اس استعداد کا کہ کسی تلخی کے بغیر
ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: skhan@vsnl.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 250,
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

فروری 2006

فہرست

الرسالہ مشن	2
جدید تعلیم یافتہ مسلمان	34
دعوتی سفر	39
سنٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی	46

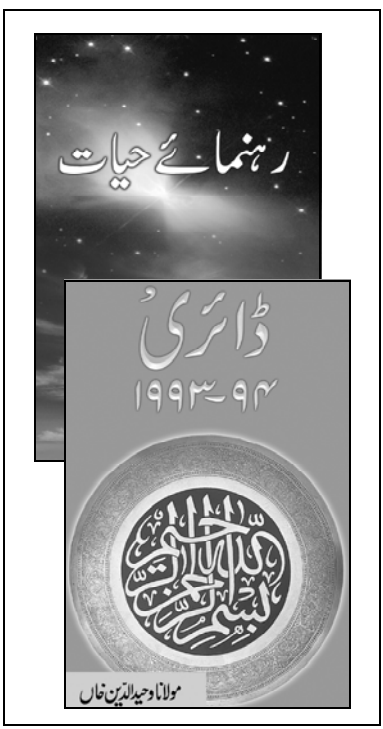

الرسالہ مشن

الرسالہ مشن اور میری زندگی دونوں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ میری پیدائش کی تخمینی تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۵ء ہے۔ جس صبح کو میری پیدائش ہونے والی تھی، اُس صبح کی رات کو میری ماں زَیبُ النساء (وفات ۱۹۸۵ء) نے ایک خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ مَیں پیدا ہوا ہوں۔ اور پھر ایک بڑا ہاتھی آیا، اُس نے اپنی سُونڈ سے اٹھا کر مجھ کو اپنی پیٹھ پر رکھا اور پھر جنگل کی طرف چلا گیا۔ یہ دیکھ کر میری ماں نے خواب میں کہا کہ دیکھو، اتنا اچھا بچّہ تھا اور ہاتھی اس کو لے کر چلا گیا۔

میں اپنی زندگی کو دیکھتا ہوں تو مجھے یہ خواب بہت بامعنیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ مجھے اُس قدیم تاریخ کا اِعادہ نظر آتا ہے جب کہ حضرت ابراہیم کی بیوی ہاجرہ چار ہزار سال پہلے شام کے علاقے سے اپنے چھوٹے بچے کو لے کر نکلیں اور عرب کے غیر آباد صحرا میں آکر رہنے لگیں۔ ہاجرہ کا یہ فعل اِس لیے تھا کہ اُن کا بچّہ اسماعیل بن ابراہیم صحرا کے غیر مُتمدّن ماحول میں پَرورش پائے۔ وہ شہری آبادی سے دور ایک ایسے ویرانے میں تربیت پاکر بڑا ہو جہاں فطرت کے سِوا کوئی اور چیز اُس کے ذہن کی تشکیل کرنے والی نہ ہو۔ ابتدائی زندگی میں میرے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہی تھا۔

میرے جدِّ اعلیٰ ضیاء الدین خاں ایک افغانی تھے۔ پانچ سو سال پہلے وہ افغانستان سے نکل کر انڈیا کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں وہ بہت سے شہروں سے گذرے، مگر وہ کہیں نہیں رکے۔ آخر کار یوپی کے علاقے میں پہنچے اور اعظم گڑھ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ میری ابتدائی زندگی اسی دور افتادہ گاؤں میں گذری۔ یہاں تمدّن جیسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میرے گاؤں کے پاس ایک ندی بہتی تھی جو گویا یہ خاموش پیغام دے رہی تھی کہ زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے نہ کہ جمود کا۔ دن کے وقت سورج کی حیات بخش روشنی اور رات کو ستاروں کی مسحور کُن جگمگاہٹ، کائنات کی معنویت کا تعارف کراتی تھی۔ گاؤں کے چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے باغ اور کھیت کی ہَریالی بتاتی تھی کہ

زندگی ایک نمو پذیر حقیقت کا نام ہے۔ تازہ ہَوا کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں ''سمع و بصر اور فُواد'' کے لیے مسلسل طور پر روحانی غذا کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔

یہ گویا فطرت کی تعلیم گاہ تھی۔ اِس تعلیم گاہ کے اندر میری شخصیت بنی۔ میرا ذوق ہر اعتبار سے فطری ذوق بن گیا۔ میری سوچ اپنے آپ وہ سوچ بن گئی جس کو آفاقیت اور حقیقت پسندی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں میرا یہ ''صحرائی تجربہ'' غالباً وہ سب سے اہم واقعہ تھا جس نے میری شخصیت کو ایک مکمل قسم کی مثبت شخصیت بنا دیا، جو ہر قسم کے منفی تصورات سے خالی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کی اُٹھائی الرسالہ تحریک دَورِ جدید کی وہ پہلی اسلامی تحریک تھی جو کسی ردّعمل کے تحت شروع نہیں ہوئی بلکہ وہ مکمل طور پر مثبت ذہن کے تحت شروع ہوئی۔

پچھلے دو سو سال کے اندر دنیا بھر کے مسلمانوں میں بہت سی تحریکیں اُٹھیں۔ ان تحریکوں کے گرد لاکھوں آدمی اکھٹا ہوئے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی تحریک حقیقی تحریک نہ تھی۔ اس پوری مدت میں الرسالہ تحریک پہلی تحریک ہے جس کو مثبت معنوں میں ایک تحریک کہا جا سکتا ہے۔

الرسالہ تحریک کو چھوڑ کر دوسری تمام تحریکیں ردِّعمل کی تحریکیں تھیں۔ مثلاً انگریزوں نے مغل سلطنت کا خاتمہ کیا تو تحریکِ آزادی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کمال اتاترک (وفات: ۱۹۳۸) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو اس کے اِحیاء کے نام پر خلافت تحریک کھڑی ہوئی۔ مغربی تہذیب کے مفروضہ یلغار کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس سے مقابلہ کرنے کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ فلسطین میں یہودیوں نے داخل ہو کر اسرائیل کی حکومت قائم کر دی تو اس کے جواب میں پُرشور تحریک شروع ہو گئی۔ اسی طرح کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپائن، اَراکان وغیرہ میں لوگوں کو مفروضہ دشمن کی طرف سے خطرہ نظر آیا تو ہر جگہ جوابی تحریک کا طوفان بَرپا ہو گیا۔ اسی طرح ہندوؤں کی طرف سے شُدھی کی اسکیم، عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا منصوبہ، جیسے واقعات نے کچھ مسلم بزرگوں میں جوش پیدا کیا اور انہوں نے ان کی روک تھام کے لیے تحریک شروع کر دی۔

ردّعمل کی تحریکوں کے اس ہجوم میں الرسالہ تحریک واحد تحریک ہے جو خالص مثبت ذہن کے

تحت شروع ہوئی۔ اس تحریک میں کسی بھی قسم کے کوئی ردِّعمل کی آمیزش نہ تھی۔ الرسالہ تحریک ابدی حقائق کی بنیاد پر اُٹھی۔ وہ وقتی ہنگاموں کے جواب میں شروع نہیں ہوئی۔

غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے، میں اعظم گڑھ کی جامع مسجد کے صحن میں پیپتے کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے اور میری زبان پر بار بار یہ الفاظ آرہے تھے:

''خداوند! تو کب آئے گا، میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں''۔

یہ گویا میرے دل کی یہ آواز تھی کہ کاش میں یہ جانوں کہ سچائی کیا ہے اور پھر میں خود اُسی سچائی کو اپناؤں اور ہر دوسرے کو اُس سے باخبر کروں۔

اِس طرح واقعات گذرتے رہے یہاں تک کہ میں نے اسلام کی صورت میں سچائی کو دریافت کرلیا۔ اس کے بعد مسلسل طور پر میں اس سچائی کے اعلان میں مشغول ہوگیا۔ غالباً ۱۹۴۸ کا واقعہ ہے، اعظم گڑھ میں بڑے پیمانے پر سالانہ نمائش کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر میں نے ایک بک اسٹال کی جگہ حاصل کی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسلامی کتابوں کا اسٹال لگایا۔ اس اسٹال کے اوپر نصب کرنے کے لیے میں نے ایک بہت بڑا بورڈ تیار کرایا۔ اس بورڈ پر جلی حرفوں میں یہ لکھا ہوا تھا:

And God calls to the home of peace.

یہ قرآن کی آیت واللہ یدعوا إلیٰ دار السلام (یونس ۲۵) کا انگریزی ترجمہ تھا۔ اِس آیت کی تشریح مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''یعنی دنیا کی زائل وفانی زندگی پر مت رجھو۔ دارُالسلام (جنت) کی طرف آؤ۔ خدا تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلاتا رہا ہے۔ وہ ہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج وغم، پریشانی، تکلیف، نقصان، آفت اور فنا وزوال وغیرہ سے صحیح وسالم رہیں گے۔ فرشتے اُن کو سلام کریں گے۔ خود ربّ العزت کی طرف سے تحفۂ سلام پہنچے گا۔ (تفسیر عثمانی، صفحہ ۲۷۳)

انگریزی کا یہ بورڈ اعظم گڑھ کے ایک آرٹسٹ محمد یوسف مرحوم نے تیار کیا تھا۔ وہ لال رنگ کے چمکدار حَرفوں میں تھا اور نمائش گاہ کے اندر داخل ہوتے ہی دور سے دکھائی دیتا تھا۔

تحریک الرسالہ کے آرگن کے طور پر ماہنامہ الرسالہ ۱۹۷۶ سے برابر نکل رہا ہے۔ جو لوگ اس کو پڑھتے رہے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ الرسالہ مشن مکمل طور پر مثبت ذہن کے تحت شروع ہوا۔ وہ ہر معاملے میں لوگوں کو مثبت رہنمائی دیتا رہا ہے۔ ۱۹۷۶ میں جب ماہنامہ الرسالہ جاری ہُوا تو اُس وقت تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ مایوسی کی بولی بول رہے تھے۔ ہر طرف یہ تأثر دیا جارہا تھا گویا کہ اُمت کا ستارہ غروب ہو چکا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ان حالات میں الرسالہ روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوا۔ چنانچہ اس کے پہلے شمارے میں اس کے صفحۂ اول پر یہ الفاظ درج تھے:

''سورج پچھّم میں غروب ہوتا ہے تاکہ وہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی ''غروب'' آخری نہیں۔ ہر غروب کے لیے ایک نیا طُلوع مقدّر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بَعد وہ از سرِ نو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ اور زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔'' (اکتوبر ۱۹۷۶)

میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک مکتب میں ہوئی۔ اس مکتب کے واحد استاد مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی (وفات ۱۹۷۲) تھے۔ اس مکتب میں میں نے قرآن اور اردو کے ساتھ عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اُس وقت ہمارے خاندان میں انگریزی تعلیم کا کافی چَرچا ہو چکا تھا۔ میرے چچازاد بھائی اقبال احمد سہیل (وفات ۱۹۵۵) سرسید کے قائم کردہ علی گڈھ کالج کے اُس اوّلین بیچ میں شامل تھے جس نے پہلی بار وہاں سے ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اِس خاندانی ماحول کے تحت، مجھے انگریزی تعلیم کی طرف جانا چاہیے تھا۔ مگر میرے کسی منصوبے کے بغیر حالات نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔

میرے والد میرے بچپن (۱۹۲۹ء) میں انتقال کر چکے تھے۔ میرے چچا صوفی عبدالمجید خاں (وفات ۱۹۴۸ء) کی حیثیت میرے خاندانی بزرگ کی تھی۔ اُن کو یہ شوق تھا کہ خاندان میں ایک شخص عالمِ دین بنے۔ چنانچہ انھوں نے اصرار کر کے ۱۹۳۸ء میں مجھے مشہور عربی درس گاہ

مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں مستطیع طالبِ علم کی حیثیت سے داخل کیا۔ آخر تک میری تعلیم کے تمام اخراجات وہ تنہا ادا کرتے رہے۔

عربی درس گاہ کی یہ تعلیم میری زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا۔ اس تعلیم کے بغیر ناممکن تھا کہ میں وہ دینی مشن شروع کروں جو میں نے بعد کو شروع کیا۔ اس مدرسے سے مجھ کو جو دینی اور علمی فائدے ہوئے وہ ایک علیٰحدہ موضوع ہے۔ یہاں میں صرف ایک واقعے کا ذکر کروں گا جو میری شخصیت کی تعمیر میں بے حد اہم ثابت ہوا۔

غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) اُس وقت مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک دن کلاس میں قرآن کی یہ آیت زیرِ بحث آئی: **وإلى الابلِ كيف خلقت** (الغاشیہ ۱۷) آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اُنھوں نے طلبا سے ایک سوال کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اونٹ کے سُم پھٹے ہوئے ہوتے ہیں یا جُڑے ہوئے۔ کلاس میں اُس وقت بیس سے زیادہ طالبِ علم تھے۔ مگر کوئی بھی یقین کے ساتھ اِس سوال کا جواب نہ دے سکا۔

اس کے بعد اُنھوں نے ایک تقریر کی۔ انھوں نے عربی مقولہ: **لا أدرى نصف العلم** (میں نہیں جانتا آدھا علم ہے) کا فلسفہ بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اپنے نہ جاننے کو جاننا، علمی سفر کی پہلی منزل ہے۔ آدمی اگر اپنی لاعلمی سے بے خبر ہو تو اس کے اندر جاننے کا شوق پیدا نہیں ہوگا، وہ بدستور بے خبر پڑا رہے گا۔ انھوں نے طلبا سے کہا کہ آپ لوگ اونٹ کے سُم کے بارے میں اپنے ''لاادری'' سے بے خبر تھے، اگر آپ اِس معاملے میں اپنے ''لاأدری'' کو جانتے تو اونٹ کو دیکھ کر آپ اس کو معلوم کر لیتے۔ لیکن اپنے ''لاادری'' کو نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار اونٹ دیکھنے کے باوجود آپ اونٹ کے سُم کے بارے میں بے خبر رہے۔

میری ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ گویا میرے تفکیری سفر کے لیے ایک رجحان ساز (trend setter) واقعہ بن گیا۔ بعد کو جب انگریزی سیکھنے کے بعد میں نے برٹرینڈ رسل کی کتاب ول ٹو ڈاؤٹ (Will to Doubt) پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی چیز تھی جس کو سائنس کی تاریخ میں روحِ تجسس (spirit of enquiry) کہا جاتا

ہے۔ چنانچہ روحِ تجسس میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ ہر چیز کی اصل کو جاننا، حتی کہ معلوم چیز کو بھی از سرِ نَو دریافت کرنا، یہ میرے ذہن کا مستقل حصہ بن گیا جو ساری عمر یکساں شدّت کے ساتھ جاری رہا۔ اسی تحقیق وتجسس کا نتیجہ تھا کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کے فضل سے، ایسی چیزیں دریافت کیں جو معلوم طور پر پوری تاریخ میں دریافت نہیں ہوئی تھیں، نہ مسلم تاریخ میں اور نہ وسیع تَر معنوں میں بشری تاریخ میں۔

مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میرا تعلیمی سفر ختم نہیں ہوا۔ اس کا ابتدائی محرک یہ تھا کہ جب میں مدرسے سے عربی اور دینی تعلیم لے کر واپس ہُوا تو میرے خاندان نے مجھے ایک نیے احساس سے دوچار کر دیا۔ میرے خاندان کے تقریباً تمام مَرد اور عورت انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ میرے خاندانی دوست عتیق احمد انصاری (حال مقیم لاہور) بہت اچھی انگریزی جانتے تھے۔ ان کی اسکولنگ لکھنؤ کے لا ماٹینیئر اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں کے لا ماٹینیئر کالج سے انگلش لٹریچر میں ایم۔ اے کیا۔ اُن سے اور خاندان کے دوسرے افراد سے مل کر مجھے بیک وقت دو احساس ہوتا تھا۔ ایک یہ کہ میں وقت کی زبان نہیں جانتا۔ دوسرے یہ کہ میں دینی تعلیم کے باوجود یہ اہلیت نہیں رکھتا کہ دورِ جدید کے ایک انسان کو اسلام کی معنویت پر مطمئن کر سکوں۔

اس تجربے کے بعد میں نے انگریزی زبان سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت میں اعظم گڑھ میں اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خان کے ساتھ مقیم تھا۔ عجیب بات ہے کہ کوئی بھی شخص مجھے حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ملا۔ میرے بڑے بھائی نے جب یہ دیکھا کہ میں انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو انھوں نے کہا: بُڈھا طوطا کیا پڑھے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں باقی منزل (اعظم گڑھ) میں انگریزی اخبار ہندستان ٹائمز کھول کر اُسے دیکھ رہا تھا کہ مولانا شہباز اصلاحی وہاں آ گیے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا: کچھ سمجھتے بھی ہیں یا یوں ہی انگریزی اخبار لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ ہر وقت میں انگریزی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ سڑک پر چلتے ہوئے بھی میرے ہاتھ میں کوئی انگریزی کتاب ہوتی تھی اور میں راستہ چلتے ہوئے اس کو پڑھتا رہتا تھا۔ میری اس عادت پر میری ماں غصہ ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم کسی نہ کسی دن سڑک پر کسی گاڑی سے ٹکرا جاؤ گے۔

انگریزی سیکھنے کے بعد میں نے دورِ جدید کے سیکولر مفکرین کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اعظم گڑھ میں انگریزی کتابوں کی ایک لائبریری تھی جس کا نام مہتا لائبریری (Mehta Library) تھا۔ میں اس کا مستقل ممبر بن گیا۔ میں تقریباً روزانہ وہاں جاتا اور وہاں مدتوں سے بند پڑی ہوئی الماریوں سے انگریزی کتابیں نکال کر گھنٹوں اُن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

اس دور کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو میں نے اپنی کتاب (مذہب اور سائنس) میں اس طرح نقل کیا ہے:

''یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ میں نے طے کیا کہ میں برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ء۔ ۱۸۷۲) کو پڑھ ڈالوں۔ خوش قسمتی سے میرے قریب شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی لائبریری میں مجھے رسل کی کتابوں کا پورا سٹ مل گیا۔ مگر جب میں اُن کتابوں کو لے کر گھر پہنچا تو میری بیوی ان کو دیکھ کر بہت متوحّش ہوئیں۔ ''اب آپ ضرور گمراہ ہو جائیں گے'' انھوں نے کہا۔ رسل اس دور کا معروف ترین ملحد ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تصنیفات کو پڑھنا عام دینی ذوق کے مطابق خطرے سے خالی نہ تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں رسل کی دنیا میں داخل ہو کر اس طرح اُس سے نکلا کہ میرا ایمان پہلے سے زیادہ پختہ ہو چکا تھا (صفحہ ۲۳)

جدیدیات کے اسی تفصیلی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ خدا کی توفیق سے میں اس قابل ہو سکا کہ اسلام کی تعلیمات کو عصری اسلوب (modern idiom) میں پیش کروں۔

اِسی کے ساتھ میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ میں اسلام کا مطالعہ از سرِ نو زیادہ تفصیل کے ساتھ اُس کے اصل مصادر کے ذریعے کروں۔ چنانچہ میں لمبی مدت تک قرآن و حدیث، سیرت اور اسلامی تاریخ کے مطالعے میں مشغول رہا۔ اس دور کے مطالعے کا ایک اندازہ اُس زمانے کے ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے جس کو میں نے اپنی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' میں نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ ۷/مارچ ۱۹۶۳ء کا ہے۔ میں نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانے کا وسطی کمرہ ہے۔ چاروں طرف تفسیر، حدیث،

فقہ، تاریخ، علمِ کلام اور لُغت کی ایک درجن سے زیادہ بڑی بڑی الماریاں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی ہیں۔ ایک بجے دن کا وقت ہے۔ کتب خانے کے بیرونی دروازے بند ہو چکے ہیں اور تمام لوگ دوپہر کے وقفے میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے ہیں۔ مکمل تنہائی کا ماحول ہے جس میں ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف کتابیں۔ مسلسل مطالعے کی وجہ سے اس وقت میری کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو۔ تفسیر ابن جریر کی ایک جلد دیکھ کر میں اُٹھا کہ اس کو الماری میں رکھ کر دوسری کتاب نکالوں۔ مگر اٹھا تو کمزوری کی وجہ سے چکّر آ گیا اور سمت بھول گیا۔ یہ میرا مدّت کا جانا پہچانا کمرہ ہے۔ مگر تھوڑی دیر تک میں وہاں اس طرح کھڑا رہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کدھر جاؤں اور کس الماری سے کتاب نکالوں۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ متعلقہ الماری فلاں سمت میں ہے'' (صفحہ ۱۴۔۱۵)

اِس طرح دوطرفہ طور پر اپنے تفصیلی مطالعے کے بعد میں نے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو مختلف اخبارات اور جرائد میں چھپتے رہے۔ اِس سلسلے میں اسلام اور عصر حاضر کے موضوع پر میری پہلی تفصیلی کتاب ''علمِ جدید کا چیلنج'' ہے جو ۱۹۶۶ میں شائع ہوئی۔ اسی طرح دین کی تعبیر وتشریح کے اعتبار سے میری پہلی مفصّل کتاب ''الاسلام'' ہے جو ۱۹۷۵ میں مکمل ہو کر شائع ہوئی۔

میں اپنے تفصیلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات مکمل طور پر خدا اور آخرت کے مرکزی تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام کی دعوت دراصل انذارِ آخرت کی دعوت ہے۔ انسان کے اندر متّقیانہ ذہن بنانا اور اس کے اندر ربّانی شخصیت کی تعمیر کرنا، یہی اسلام کی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔ یہی ذہن میرا پہلے بھی تھا اور یہی ذہن آج بھی ہے۔

اس حقیقت کو نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص میری ابتدائی تحریروں کا مجموعہ پڑھے جو ''قرآن کا مطلوب انسان'' کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اور

دوسری طرف وہ ماہنامہ الرسالہ میں میری بعد کی تحریروں کو پڑھے، دونوں کے درمیان وہ حیرت انگیز مشابہت پائے گا۔

قرآن کا مطلوب انسان نامی کتاب کے صفحہ ۶۰ ۔ ۶۲ پر ایک مضمون چھپا ہے۔ یہ مضمون پہلی بار جماعتِ اسلامی کے سہ روزہ اخبار دعوت کے شمارہ ۵ ستمبر ۱۹۵۵ میں چھپا تھا۔ یہ مضمون دعوتِ اسلامی کے موضوع پر تھا۔ اس مضمون میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ اسلامی دعوت دراصل انذارِ آخرت کا دوسرا نام ہے نہ کہ اقامتِ سیاست کا۔ اِس کے بعد کوئی شخص ماہنامہ الرسالہ کا شمارہ دسمبر ۲۰۰۴ دیکھے۔ اُس میں وہ چار صفحے کے اُس مضمون کو پڑھے جو اِس عنوان کے تحت چھپا ہے: ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا۔ اِن دونوں تحریروں کے درمیان اگرچہ تقریباً ۵۰ سال کا فاصلہ ہے مگر دونوں کا مضمون مکمل طور پر ایک ہے۔ یہ تقابل صاف طور پر بتا رہا ہے کہ ۲۰۰۴ میں میرا جو دعوتی ذہن ہے ٹھیک وہی ذہن میرے اندر ۱۹۵۵ میں بھی موجود تھا۔

اس کے بعد میں نے سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع کیے۔ میری ان تمام تحریروں میں مشترک طور پر یہی ذہن پایا جاتا ہے — ایک طرف اسلام کا ایسا علمی تعارف جس میں آج کا انسان یہ محسوس کرے کہ اسلام آج بھی اُتنا ہی ریلیونٹ (relevant) ہے جتنا کہ وہ اپنے ابتدائی دَور میں تھا۔ دوسرا پہلو جو میری تحریروں کا خاص موضوع رہا ہے وہ ہے اسلام کو بعد کی آمیزشوں سے پاک کرنا اور اُس کو اُس کی خالص صورت میں پیش کرنا۔

میرے ذہن میں اوّل روز سے یہ تھا کہ مجھے اپنی کوئی علیٰحدہ جماعت بنانا نہیں ہے بلکہ موجودہ جماعتوں اور اداروں سے مل کر کام کرنا ہے۔ اِس سلسلے میں میں اکثر بڑی جماعتوں اور اداروں کے ساتھ تنظیمی طور پر وابستہ ہوا۔ مگر تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ ہر جماعت اور ہر ادارہ، گروہی عصبیت کا شکار ہے۔ میرے جیسا آدمی کسی بھی ادارے یا جماعت کے ساتھ زیادہ فعّال انداز میں کام نہیں کرسکتا۔

مثلاً میں اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی ہند سے وابستہ ہوا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ جماعتِ اسلامی کی فکر کا سرچشمہ حقیقتاً قرآن اور سنت نہیں ہے بلکہ وہ قرآن اور سنّت کی ایک منحرف سیاسی تعبیر

ہے۔ چنانچہ میں زیادہ دیر تک جماعت اسلامی کے ساتھ نہ چل سکا۔ اِسی طرح کچھ عرصے کے لیے میری وابستگی تبلیغی جماعت سے ہوئی، مگر اس سے قریب ہوکر معلوم ہُوا کہ تبلیغی جماعت بھی اصلاً قرآن اور سنت پر نہیں کھڑی ہوئی ہے بلکہ وہ خود اپنی ''جماعتی انجیل'' پر کھڑی ہوئی ہے، جس کا نام ''فضائل اعمال'' ہے۔ اسی طرح میں چند سال کے لیے ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے وابستہ رہا، مگر میں نے پایا کہ یہاں کے ماحول میں خدا پرستی سے زیادہ شخصیت پرستی کا غلبہ ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک مبتدعانہ مزاج تھا۔ میں اس مزاج کے ساتھ مصالحت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے اُس سے بھی میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ یہی معاملہ جَمعیّت علماءِ ہند کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے ساتھ میں چند سال تک وابستہ رہا مگر آخر کار معلوم ہوا کہ جمعیتِ علماء کا سارا زور ملّی سیاست پر ہے۔ اور ملّی سیاست میرے دعوتی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اِن تجربات کے بعد آخر کار میں نے ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری کیا۔ الرسالہ اپنی ابتدا ہی سے صرف ایک ماہنامہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک مشن تھا۔ الرسالہ کا مقصد اسلام کو مسلمانوں کی قومی سیاست سے الگ ہوکر خالص دعوتی حیثیت سے زندہ کرنا تھا۔ خدا کی توفیق سے الرسالہ اِسی نہج پر قائم ہے۔ کوئی بھی شخص الرسالہ کے شماروں کا مطالعہ کرکے اِس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد جب مسلم تاریخ کا نیا دور شروع ہوا تو عین اُسی کے ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ فساد کا سنگین مسئلہ شروع ہوگیا۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے افراد کو اس مسئلے کا حل صرف یہ نظر آیا کہ وہ اپنے مفروضہ حریفوں کے خلاف احتجاج اور شکایت کا بے فائدہ طوفان جاری کردیں۔

میں نے اس مسئلے کا مطالعہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں کیا اور پھر مسلسل جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے اور وہ اعراض ہے۔ مسلمان ہندوؤں کی مفروضہ اشتعال انگیزی پر اعراض کا طریقہ اختیار کریں اور پھر کوئی فساد نہ ہوگا۔ لمبی مدّت کی اس صبر آزما کوشش کے بعد آخر کار مسلمانوں کی سمجھ میں یہ قرآنی اصول آگیا اور انھوں نے اس کو اختیار کرلیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب انڈیا میں فرقہ وارانہ فساد صرف ماضی کی ایک یاد بن کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح آزادی کے بعد تبادلۂ آزادی کے نتیجے میں یہ ہُوا کہ ہندستان کی سرکاری ملازمتوں

میں اچانک مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہوگیا۔ تعلیمی اداروں میں داخلہ لینا بھی اُن کے لیے ایک مشکل امر بن گیا۔ اس موضوع پر بھی مسلمانوں نے اپنے مزاج کے مطابق مطالباتی مہم شروع کردی۔ اس مہم کا خاص نکتہ رزرویشن تھا۔ مسلمانوں کی عمومی سوچ یہ بن گئی کہ جب تک مسلمانوں کو خصوصی رعایت نہ دی جائے وہ دوبارہ سروسوں میں اپنا مقام نہیں حاصل کرسکتے۔

اس موضوع پر میرا ذہن مکمل طور پر مختلف تھا۔ میں جانتا تھا کہ زندگی میں کامیابی کا راز اِس امر پر ہے کہ آدمی اپنی اہلیت ثابت کرسکے۔ یہ دنیا مقابلے کی دنیا ہے، یہاں رزرویشن کی بات کرنا ایک ایسی خلافِ فطرت بات ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ لمبی جدوجہد کے بعد اِس پہلو سے بھی مسلمانوں کا ذہن بدلا اور اب سارے ملک میں مسلمان نہایت تیزی کے ساتھ تعلیم کے میدان میں جدوجہد کررہے ہیں اور اُس کا مفید نتیجہ حاصل کررہے ہیں۔

اسی طرح مختلف واقعات کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا ماحول قائم ہوگیا تھا۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کی ترقی کے لیے خطرناک تھی۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے نتیجے میں وہ معتدل ماحول ختم ہورہا تھا جو دعوتی عمل کے جاری رہنے کے لیے ضروری ہے۔ اس منفی ذہن کو ختم کرنے کے لیے میں نے مسلسل تقریری اور تحریری جدوجہد شروع کردی جو خدا کے فضل سے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

اس منفی ذہن کو ختم کرنے کے لیے میں نے دوطرفہ کوشش کی۔ ایک طرف ہندوؤں کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ سوچ کو کمزور کیا۔ یہ مہم اس حد تک کامیاب ہوئی کہ ہندوؤں کی ''اَینٹی مسلم پارٹی'' کی سوچ بنیادی طور پر بدل گئی۔ پہلے یہ لوگ صرف ہندوؤں کو اپنا ووٹ بینک سمجھتے تھے، اس لیے وہ مسلمانوں کو نظرانداز کرتے تھے۔ اب وہ سمجھنے لگے کہ اپنی سیاسی کامیابی کے لیے اُنہیں لازمی طور پر مسلم ووٹ کی ضرورت ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی سیاسی فکر مکمل طور پر بدل گئی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، میں نے پایا کہ ان کی منفی سوچ کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ ہندستان کو اپنے لیے ایک پَرابلم کنٹری سمجھتے ہیں۔ میں نے مسلسل کوشش کے ذریعے اُن کو بتایا کہ

ہندستان اُن کے لیے مواقع (opportunities) کا مُلک ہے نہ کہ مسائل (problems) کا ملک۔ اِس کوشش کی ایک جھلک میری کتاب ''ہندستانی مسلمان'' میں دیکھی جاسکتی ہے، جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ اِن کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کا ذہن بڑے پیمانے پر بدلا۔ ہندستان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر وہ معتدل سوچ پیدا ہوئی جو دُنیوی ترقی اور دعوتی عمل کے لیے یکساں طور پر ضروری ہے۔

موجودہ زمانہ ایک اعتبار سے ڈائیلاگ کا زمانہ ہے۔ ساری دنیا میں مسلسل طور پر مختلف طبقوں کے درمیان ڈائیلاگ اور تبادلۂ خیال جاری ہے۔ یہ زمانی رُجحان مذہب کے میدان میں بھی بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ ہندستان میں اور ساری دنیا میں یہ ہورہا ہے کہ مختلف مذاہب کی مشترک کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ اِن میں ہر مذہب کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس محاذ پر اسلام کی نمائندگی بہت کمزور ہے۔ مسلمان یا تو ان مشترک کانفرنسوں میں شرکت نہیں کرتے یا اگر کوئی مسلمان وہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ اسلام کی نمائندگی اُس مطلوب انداز میں نہیں کرپاتا جو آج کی دنیا میں معیاری انداز سمجھا جاتا ہے۔

میں نے اس اعتبار سے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کیا اور جہاں بھی موقع ملا وہاں پہنچ کر اسلام کی مثبت نمائندگی کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع کردیا۔

یہ مہم ابتدائی طور پر ۱۹۴۸ میں شروع ہوئی۔ تاہم اُس کا مطبوعہ آغاز ۱۹۵۹ میں ہوا۔ نومبر ۱۹۵۹ء کو سیوہارہ (بجنور) میں آریہ سماج کے تحت مختلف مذاہب کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر میں نے ایک مقالہ پیش کیا جو پہلی بار جنوری ۱۹۶۰ میں ''اسلام کا تعارف'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کانفرنس کے صدر بریلی کے ایک ہندو ایڈوکیٹ تھے۔ اُنہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ ''آج کے جلسے میں جو تقریریں ہوئیں اُن میں سب سے زیادہ ریلیوینٹ (relevant) تقریر مولانا صاحب کی تھی''۔

آریہ سماج کی گولڈن جُبلی کے موقع پر الٰہ آباد میں ۲۰ مئی ۱۹۶۰ کو ''سرودھرم سمّیلن'' کا

ایک پروگرام ہُوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے علماء کو دعوت دی گئی کہ وہ سمّیلن میں شریک ہوکر مندرجہ ذیل عنوان کے تحت اپنے اپنے مذہب کی برتری ثابت کریں— ''مانو وکاس کے لیے آپ ہی کے دھرم کو ماننا کیوں آوشیک ہے''۔ اس دعوت نامے کے جواب میں مَیں نے اس موقع پر ایک مقالہ پیش کیا جو بعد کو ''منزل کی طرف'' کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۷۶ء سے اس سلسلے میں میری زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس سال میں نے ایک مسلم۔ کرسچن ڈائیلاگ میں شرکت کی جو لیبیا کی راجدھانی طرابلس میں ہوا تھا۔ اس میں اسلام کی طرف سے جامعۃ الازہر (قاہرہ) نے شرکت کی، اور ویٹکن (روم) نے مسیحیت کی طرف سے نمائندگی کی۔ اس کی دعوت پر میں نے اُس میں شرکت کی اور زیرِ بحث موضوع پر ایک مقالہ (انگریزی زبان میں) پیش کیا۔ میری اِس شرکت کی تفصیل ''سفرنامہ'' جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد عالمی سفروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مسلسل طَور پر مختلف مذاہب کی عالمی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے اِن کانفرنسوں میں ہر جگہ بُلایا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے بارے میں یہ مشہور ہوگیا کہ وہ مسلم علماء میں معتدل اور سائنٹفک ذہن کے آدمی ہیں اور اسلام کی پُر امن تشریح پیش کرتے ہیں۔ اِس طرح مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں ہر جگہ جاکر عالمی اجتماعات میں اسلام کی تعلیمات کو مثبت انداز میں پیش کروں۔ یہ اسفار جو تادمِ تحریر جاری ہیں اُن کا مختصر تذکرہ میرے ان سفروں میں دیکھا جاسکتا ہے جو برابر الرسالہ میں چھپتے رہتے ہیں۔

اِن سفروں کے تجربات بہت سبق آموز ہیں۔ مثلاً میں نے غیر مسلموں کے ایک اجتماع میں اسلام کا تعارف پیش کیا۔ اس میں میں نے کہا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر انسانی خیر خواہی کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کو انسان دوست (insan friendly) بناتا ہے۔ آخر میں ایک غیر مسلم نے کھڑے ہوکر کہا کہ آج میں نے اسلام کا سچّا تعارف حاصل کیا۔ اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ آج سے میں نہ صرف انسان فرینڈلی بنوں گا بلکہ اسی کے ساتھ میں اسلام فرینڈلی بھی بنوں گا۔

اسی طرح میری ایک تقریر ایک یونیورسٹی کے ہال میں ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے بتایا کہ

اسلام کی تعلیمات کیا ہیں۔ میں نے یہ تعارف قرآن اور حدیث کی روشنی میں پیش کیا۔ آخر میں ایک غیر مسلم پروفیسر نے کھڑے ہوکر کہا کہ: اگر یہی اسلام ہے پھر تو کوئی مسئلہ نہیں:

If this is Islam, then where is the problem.

غیر مسلموں کے اداروں اور کانفرنسوں میں میری تقریروں کا مثبت اثر ہُوا۔ اکثر جگہ انھوں نے میری تقریروں کو اپنی رپورٹ میں چھاپا۔ غیر مسلموں کی طرف سے شائع ہونے والی میگزینوں اور ان کی کتابوں میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے۔ کئی غیر مسلم اداروں نے مجھ سے یہ پیش کش کی کہ آپ اسلام کے مثبت اور حقیقی تعارف پر ایک کتاب تیار کرکے ہم کو دیجئے۔ ہم اس کو اپنے خرچ پر چھاپ کر دنیا میں پھیلائیں گے۔

اسی طرح سے غیر مسلم اخباروں اور ریڈیو اور ٹی وی میں مسلسل انٹرویو کی صورت میں اسلامی تعلیمات کا تعارف پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک مستقل کام تھا۔ اس کام کی مختصر سرگذشت ماہنامہ الرسالہ کے شماروں میں ''خبرنامہ'' کے عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

پرنٹنگ پریس کا زمانہ آنے کے بعد مسلم رہنماؤں نے بے شمار کتابیں چھاپیں، اخبارات اور رسائل جاری کیے مگر تقریباً سب کے سب ردّعمل کے تحت نکلے۔

اصل یہ ہے کہ جب پرنٹنگ پریس کا زمانہ آیا تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی مسیحی قوموں نے استعمار کے نام پر پوری مسلم دنیا پر براہِ راست یا بالواسطہ غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر مغربی قوموں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ اس ماحول میں جب پریس کے ذریعے مسلمانوں کے جذبات ظاہر ہونا شروع ہوئے تو انھوں نے بہت جلد منفی صورت اختیار کر لی۔ پوری مسلم دنیا کا پریس منفی طرزِ فکر کی اشاعت کا ذریعہ بن گیا۔ عربی پریس ''الجهاد هُو الحلّ الوحيد'' جیسے عنوانات سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ دوسری طرف اُردو پریس میں اس طرح کے جنگ جُو نغمے سنائی دینے لگے:

شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کُشائی

اس منفی ماحول میں غالباً ماہنامہ الرسالہ پہلا اشاعتی پروگرام تھا جو خالص مثبت ذہن کے تحت شروع کیا گیا اور برابر مثبت ذہن کے تحت جاری رہا۔ کوئی بھی شخص جو الرسالہ اور دوسرے مسلم جرائد کا تقابلی مطالعہ کرے گا وہ اس فرق کو تسلیم کرے گا، خواہ وہ اس سے اتفاق کرتا ہو یا نہ کرتا ہو:

عرب دنیا میں ایک عربی شاعر کا یہ شعر مدتوں سے گونج رہا تھا:

هات صلاحَ الدين ثانية فينا جدّدی حِطّين أو شبه حطّينا

دوسری طرف برّصغیر ہند میں مسلم شاعر کا یہ شعر گرمیٔ مجلس کا ذریعہ بنا ہُوا تھا:

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے کیا کسی کو، پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اِن حالات میں ماہنامہ الرسالہ پوری مسلم دنیا میں ایک صحافتی استثناء کے طور پر اُبھرا۔ اُس نے لوگوں کو بتایا کہ زندگی کا راز پُر امن جدوجہد میں ہے نہ کہ متشدّدانہ جدوجہد میں۔ نیز یہ کہ موجودہ زمانہ میں عمومی تباہی کے ہتھیار (weapons of mass destruction) کے ظہور کے بعد مُسلّح جدوجہد یا جنگی کارروائی عملاً بے فائدہ ہوچکی ہے کیوں کہ اب تشدّد کا طریقہ صرف کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوگا، وہ کسی مثبت نتیجے تک پہنچنے والا نہیں۔

الرسالہ جیسے ایک ماہنامہ کو شائع کرنا میرے لیے ایک مشکل ترین کام تھا۔ اُس زمانے میں دہلی میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان مسٹر تنویر احمد رہتے تھے۔ اُن سے میں نے ذکر کیا کہ میں ایک ماہنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فوراً کہا کہ آپ کا ماہنامہ کبھی نہیں چلے گا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آپ کے مزاج کو میں جانتا ہوں۔ آپ جو ماہنامہ نکالیں گے وہ ایک سجیسٹیو (suggestive) پرچہ ہوگا۔ جب کہ آج کا انسان صرف انفارمیٹیو (informative) پرچہ پسند کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا رسالہ اگر معلوماتی رسالہ ہو تو لوگ معلومات کو جاننا چاہتے ہیں، مگر لوگوں کو یہ بتانا کہ تم یہ کرو اور وہ نہ کرو، ایک غیر مطلوب آواز ہے۔ کیوں کہ آزادی کے اس دَور میں ہر انسان اپنا رہنما آپ ہے، وہ کسی اور کو اپنا رہنما بنانے کے لیے تیار نہیں۔

اسی طرح میں نے جس سے بھی مشورہ لیا اُس نے یہی مشورہ دیا کہ آپ ہرگز کوئی ماہنامہ نہ

نکالیں کیوں کہ وہ لازمی طور پر ناکام ہوجائے گا۔ اُردو کے تجربہ کار صحافی بانیٔ ''نئی دنیا'' مولانا عبدالوحید صدیقی (وفات: ۱۹۸۶) اُس وقت نظام الدین ایسٹ میں رہتے تھے اور میں پرانی دہلی میں جمعیت بلڈنگ کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ ایک دن میں ان سے مشورہ لینے کے لیے نظام الدین ایسٹ گیا۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو اُس وقت وہ بیمار تھے اور اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُن سے میں نے کہا کہ میں ماہنامہ الرسالہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر وہ اُٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیے اور کہا کہ ماہنامہ نکالنے کا نام بھی نہ لیجئے۔ کیوں کہ اس قسم کا ماہنامہ کبھی چلنے والا نہیں۔

غرض ہر ایک سے مجھے مایوس کن مشورہ ملا۔ میں اِن منفی مشوروں سے بہت پریشان ہُوا اور دعائیں کرنے لگا۔ پھر ایک رات میں نے اس معاملے پر استخارہ کیا۔ عشاء کے بعد دو رکعت استخارے کی نماز ادا کر کے دعا کی اور سو گیا۔ رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی گائے ہے جس کا دودھ خشک ہو چکا ہے۔ میں ایک بڑی بالٹی لے کر آتا ہوں، میں نے اس بالٹی کو گائے کے تھن کے نیچے رکھا اور اپنے ہاتھ سے دودھ نکالنے لگا۔ وہاں آس پاس کئی لوگ موجود تھے۔ وہ ہنس کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو، اس نادان کو وہ سوکھی گائے سے دودھ نکالنا چاہتا ہے۔ مگر جب میں نے اپنا ہاتھ گائے کے تھَن سے لگایا تو اس سے دودھ نکلنے لگا۔ اور پھر دودھ اتنا زیادہ نکلا کہ پوری بالٹی بھر گئی اور دودھ بالٹی سے نکل کر زمین پر بہنے لگا۔

اس خواب کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ماہنامہ ''الرسالہ'' جاری کرنا ہے۔ رسالے کا یہ نام ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں (پیدائش ۱۹۴۸) نے تجویز کیا تھا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں صاحب سے پانچ ہزار روپئے کا ابتدائی عطیہ لیا اور اکتوبر ۱۹۷۶ میں الرسالہ کا پہلا شمارہ شائع کر دیا۔ ماہنامہ الرسالہ کا اجراء میں نے بے سروسامانی کے عالم میں کیا تھا۔ اُس کے ابتدائی دور میں عبدالعزیز خاں مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کا تعاون میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوا۔ اُن کا یہ قیمتی تعاون کئی سال تک مسلسل جاری رہا۔ بعد کے دور میں ماہنامہ الرسالہ کے قیام و بقا میں سب سے زیادہ حصہ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں (پیدائش ۱۹۵۹) کا رہا ہے۔ یہ سب کچھ بلاشبہہ اللہ کی توفیق سے ہوا۔

الرسالہ جاری کرنے سے پہلے میں اُردو دنیا میں معروف ہو چکا تھا۔ میرے مضامین بہت سے اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ مثلاً نگار، شاعر، پیامِ تعلیم، عصمت، ندائے ملّت، الفرقان، دعوت، زندگی وغیرہ۔ اس کے علاوہ سہ روزہ ''الجمعیۃ'' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۶۷ سے لے کر ۱۹۷۴ تک برابر میرے مضامین چھپتے رہے تھے۔

اس طرح ماہنامہ الرسالہ جاری کرنے سے پہلے ہی میرا ایک وسیع حلقۂ تعارف بن چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر لوگوں کے علم میں یہ بات آجائے کہ میں ایک ماہنامہ نکال رہا ہوں تو ضرور وہ اس کے خریدار بن جائیں گے۔ مگر یہاں غیر مُتوقّع طور پر ایک حادثہ پیش آیا۔ مسلم جماعتوں اور مسلم اداروں کے اخبارات اور رسائل میں الرسالہ کا اشتہار چھاپنے کے لیے دیا گیا، مگر قیمت ادا کرنے کے باوجود اُن میں سے کوئی بھی الرسالہ کا اشتہار چھاپنے پر راضی نہیں ہُوا۔ اس واقعے کا ذکر میری ڈائری میں اس طرح آیا ہے:

''احمد دیدات صاحب نے ساؤتھ افریقہ (ڈربن) میں اسلامک پروپیگیشن سنٹر قائم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ادارے کی طرف سے ایک اشتہار ٹائم میگزین (نیویارک) میں چھپنے کے لیے بھیجا۔ یہ قرآن (ترجمہ) کا اشتہار تھا۔ اِس اشتہار میں اس قسم کے الفاظ تھے:

Establish the kingdom of God on Earth.
The Future world Constitution.

اس ایک صفحے کے اشتہار کی قیمت ستّر ہزار ڈالر تھی۔ مگر ٹائم میگزین نے اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ احمد دیدات صاحب کے انگریزی پرچہ (البرہان دسمبر ۱۹۹۰) میں یہ قصہ چھاپا گیا ہے۔ اور یہ تاثر دیا گیا ہے کہ مغرب کے لوگ اسلام کے بارے میں سخت متعصب ہیں۔

میرے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں۔ مغرب سے مسلمانوں کو بے شمار فائدے پہنچ رہے ہیں۔ اُن فائدوں کا ذکر نہ کر کے مذکورہ واقعے کو سنسنی خیز انداز میں بیان کرنا سخت مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی مدعو قوموں کے بارے میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے موجودہ زمانے میں یہی کام مسلسل کر رہے ہیں۔

میرا خود تجربہ ہے کہ جب الرسالہ نکلا تو میں نے اس کا اشتہار اخبار الجمعیۃ، دعوت، تعمیر حیات اور الکفاح وغیرہ میں دینا چاہا، مگر سب نے انکار کر دیا۔ حالاں کہ ہم اس کی پوری قیمت ادا کر رہے تھے۔ ٹائم نے اگر ''اسلام دشمنی'' میں اشتہار نہیں چھاپا تو مذکورہ مسلم پرچوں نے الرسالہ کا اشتہار چھاپنے سے کیوں انکار کیا''۔ (ڈائری ۹۱۔۹۲ صفحہ ۱۲۔۱۳)

تاہم میرا دعوتی جذبہ میرا رہنما ثابت ہوا۔ آخر کار اللہ کے بھروسے پر میں نے اکتوبر ۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ کا اجرا کر دیا۔

شروع میں نہایت صبر آزما حالات پیش آئے۔ لوگوں نے ہر طرف میرے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ ان کے اندر مستقل مزاجی نہیں ہے، تھوڑے دنوں وہ پرچہ نکالیں گے اور اس کے بعد وہ بند ہو جائے گا۔ اس لیے الرسالہ کو پسند کرنے والے بھی اس کی سالانہ خریداری شروع کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ اُسی زمانے کا واقعہ ہے، میں دہلی شہر میں کسی مقام پر گیا ہوا تھا، واپس ہو کر جمعیۃ بلڈنگ میں داخل ہوا تو دروازے پر مولانا اخلاق حسین قاسمی مل گئے۔ اُنھوں نے کہا: آپ نے ماہنامہ الرسالہ تو نکال دیا ہے، کیا اُس کے لیے کچھ فنڈ بھی اکھٹا کیا ہے۔ دیوانگی کے عالم میں میری زبان سے نکلا: کیا خدا سیف سائڈ (safe side) میں رہے گا۔

یہ دیوانگی کا ایک کلمہ تھا جو اس کیفیت کے ساتھ میری زبان سے نکلا جس کا ذکر حدیث میں ان الفاظ میں آیا ہے: **رُبَّ اَشعَثَ أغبَر مدفوع بالأبواب، لو أقسم على الله لأبرّه۔**

اس کے بعد ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ میں نے اعلان کر دیا کہ لوگ الرسالہ کی ایجنسی لے کر اُس کو پھیلائیں۔ اگر وہ کسی وقت محسوس کریں کہ ایجنسی کے تحت منگائے ہوئے شمارے فروخت نہیں ہو رہے ہیں تو وہ غیر فروخت شدہ پرچوں کو بھیج کر اُن کی پوری قیمت واپس لے سکتے ہیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے ایجنسی کے تحت الرسالہ منگانا شروع کر دیا۔ اس طرح اچانک الرسالہ ہر جگہ پھیل گیا۔

الرسالہ کی فطری آواز بہت جلد لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے لگی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو

محسوس ہوا کہ الرسالہ اسلام کو آج کے انسان کے لیے قابلِ فہم انداز میں پیش کر رہا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا:

Al-Risala presents Islam as a living force.

خدا کے فضل سے بہت جلد ایسا ہوا کہ الرسالہ کی آواز پھیلنے لگی۔ دنیا کے ہر حصے میں اُس کے پڑھنے والے پیدا ہو گئے۔ اُس کی مقبولیت صرف اُردو خواں طبقے میں نہیں بڑھی بلکہ دوسروں میں بھی۔ بہت سے لوگ جو اُردو نہیں پڑھ سکتے تھے اُنھوں نے باقاعدہ ٹیوٹر رکھ کر اُردو پڑھی تاکہ وہ براہِ راست الرسالہ پڑھ سکیں۔ اسی قسم کے ایک صاحب مسٹر کشن جیونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) ہیں جن کا ذکر الرسالہ (مارچ ۲۰۰۳، صفحہ ۳۸) میں آچکا ہے۔ ایک عرب عالم شیخ محمد سلیمان القائد الرسالہ کے اتنے گرویدہ تھے کہ وہ ایک بنگلہ دیشی عالم کو ایک سو ڈالر ماہانہ دیتے تھے تاکہ وہ الرسالہ کا عربی ترجمہ کر کے اُنہیں دیا کرے، وغیرہ۔

میں پاکستانی تحریک کا کبھی حامی نہیں رہا۔ مگر عجیب بات ہے کہ پاکستان میں بھی الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ اتنی زیادہ مقبول ہوئیں کہ آج پاکستان کے اکثر پڑھے لکھے لوگ اُس سے واقف ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ ماہنامہ الرسالہ انڈیا کا واحد پرچہ ہے جو ہر مہینے اُسی طرح پاکستان سے شائع ہوتا ہے جس طرح وہ انڈیا سے چھپتا ہے۔ پاکستان کے سفر میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مجلس میں پاکستانی جرائد سے تعلق رکھنے والے کچھ صاحبان موجود تھے۔ میں نے یہ پوچھا کہ پاکستان میں کون سا دینی ماہنامہ ہے جو مختلف حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ شرکاء میں سے ایک صاحب نے کہا کہ پاکستان میں تو ایسا کوئی دینی ماہنامہ نہیں۔ اگر کوئی ماہنامہ یہاں مختلف حلقوں میں پڑھا جاتا ہوگا تو وہ ماہنامہ الرسالہ ہی ہوگا۔

الرسالہ شروع سے ایک دعوتی مشن کا ترجمان تھا۔ الرسالہ کی اس نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے بہت بھاری قیمت دینی پڑی۔ مثلاً الرسالہ میں چھاپنے کے لیے قیمتی اشتہارات مِل رہے تھے مگر قصداً اُن کو نہیں لیا گیا۔ کیوں کہ اس سے الرسالہ کا داخلی ماحول متأثر ہو جاتا۔ الرسالہ میں دوسروں کے مضامین نہیں لیے گیے۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ لوگوں کے ہر مضامین میں کچھ نہ کچھ

انحراف پایا جاتا ہے۔ مثلاً فرقہ وارانہ تعصب کی بُو، مسلمانوں کے تشدّد کی تبریر، اپنی قوم کی وکالت، سیاسی سوچ کی آمیزش، صحیح میں غلط کو ملانا، غیر دعوتی انداز اور غیر مسلموں کو مَدعو کے بجائے حریف کی حیثیت دینا، وغیرہ۔ چنانچہ مجھے غیر معمولی مشقت اُٹھا کر یہ کرنا پڑا کہ الرسالہ میں صرف میرے مضامین ہوں تاکہ فکری تشکیل وتربیت کے عمل میں کوئی رُکاوٹ نہ پڑے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مزاج کے تحفّظ کے لیے مجھے بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ اُنھیں میں سے ایک وہ ہے جس کا ذکر ڈائری (۱۹۸۹۔ ۱۹۹۰) میں آیا ہے۔ ڈائری کا یہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ڈاکٹر عبدالحلیم عُویس ریاض کی جامعۃ الامام میں علومِ اجتماعیہ کے پروفیسر ہیں۔ وہ میری تحریروں کے بہت قدرداں ہیں اور سعودی عرب کے اونچے حلقوں سے قریبی روابط رکھتے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۶ کے دوسرے ہفتے میں وہ دہلی آئے اور ہمارے مرکز میں ٹھہرے۔ اُن کے اِس قیامِ دہلی کا ایک واقعہ الرسالہ اپریل ۱۹۸۷ (صفحہ ۸) میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کی اِس آمد کا مقصد یہ تھا کہ الرسالہ کے عربی ایڈیشن کے معاملات طے کریں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کو اُنہوں نے راضی کرلیا کہ وہ ترجمہ اور ایڈٹ کرنے کا کام کریں گے۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اس کا سارا خرچہ مکمل طور پر سعودی عرب سے پورا کیا جائے گا اور تمام عالمِ عرب میں اُس کو پھیلایا جائے گا۔

تاہم میں اس پیش کش کو قبول نہ کرسکا۔ کیوں کہ اس میں میرے لیے ذاتی شہرت کا موقع تو بہت تھا، مگر میرا اصل مقصد اس سے حاصل نہیں ہورہا تھا۔ اور اس کی وجہ اُن کی یہ شرط تھی کہ اس عربی الرسالہ میں ۵۰ فیصد مضامین الرسالہ والے ہوں گے اور بقیہ ۵۰ فیصد مضامین عرب اہل قلم کے ہوں گے۔ یہ میرے نزدیک فکری رُکون (بنی اسرائیل ۷۴) کے ہم معنٰی تھا۔ اس لیے میں اس کو قبول نہ کرسکا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ عرب اہل قلم

عام طور پر سیاسی یا منفی انداز میں لکھتے ہیں۔

۵۰ فیصد کی اس تقسیم کے بعد الرسالہ کا نقشہ کیا ہوتا، اس کی ایک مثال مسلمانوں کے موجودہ پَرچے ہیں۔ جن میں ہمیشہ دعوت کے ساتھ غیر دعوت کا عُنصر بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۱۶ جنوری ۱۹۸۹) میں ڈاکٹر عبدالحلیم عُویس کا ایک مضمون ہے، جس میں دعوت کو ''المفتاح العظیم'' بتایا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ مسلمان داعی بن کر دوسری قوموں کے اوپر فتح حاصل کریں (صفحہ ۵۰) دوسری طرف اسی عربی پرچے میں ۶ صفحات کا ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہے: **الأقلّیات المسلمة تواجه خطر الذوبان** (یعنی مسلم اقلیت کے لیے اکثریت میں جذب ہونے کا خطرہ)

یہ خطرہ کس کی طرف سے ہے۔ یہ اُنھیں غیر مسلم قوموں کی طرف سے ہے جن کے اوپر دعوت کا کام کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ لوگ جن کو مَدعو کہا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی پرچے میں ایک طرف مسلمانوں کو داعی بننے پر اُبھارا جارہا ہے اور اسی پَرچے میں دوسری طرف کہا جارہا ہے کہ تمہارا مدعو تمہارے لیے خطرہ ہے۔ یہ بات داعیانہ نفسیات کے سراسر خلاف ہے۔ جو لوگ اِس طرح کی منفی نفسیات میں مبتلا ہوں، وہ کبھی دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔'' (صفحہ ۲۵۔۲۶)

الرسالہ مشن کے سامنے جو نشانہ تھا اُس میں ایک اہم پہلو یہ تھا — مغرب کے خلاف مسلمانوں کے منفی ذہن کو ختم کرنا۔ یہ مہم خدا کی توفیق سے مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ اب اس کے اثرات مختلف صورتوں میں نمایاں ہورہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی دینی درس گاہ کا قیام (حیدرآباد) جس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو، یہ براہِ راست طور پَر الرسالہ مشن کا ایک نتیجہ ہے، وغیرہ۔

موجودہ زمانے کے مسلمان عام طور پر مغربی قوموں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی رائے اہلِ مغرب کے معاملے میں منفی ہوگئی۔ وہ ان سے استفادہ کرنے کے قابل نہ

رہے۔ اس کا سبب مغربی قوموں کا مسلم دنیا پر غلبہ تھا۔ مگر مسلم رہنما یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ یہ غلبہ کسی سازش یا ظلم کا نتیجہ نہیں، وہ فطرت کے اُس قانون کا نتیجہ ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وأمّا ما ينفع الناس فيمكث في الأرض:

While that which is for the good of mankind remains on earth (13:17)

مغربی قومیں نَو آبادیاتی دَور کے زمانے میں مسلم ملکوں پر چھا گئیں۔ ایسا اِس لیے ہُوا کہ یہ لوگ عملی اور فکری اعتبار سے ایسی چیزیں لائے تھے جو فکری اور عملی اعتبار سے مفید تھیں، اِس لیے لوگوں نے نہایت آسانی کے ساتھ اُن کے غلبے کو قبول کرلیا۔ یہ عَین وہی معاملہ تھا جو اِس سے پہلے خود مسلمانوں کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں اہلِ اسلام دنیا کے بڑے حصے پر غالب آئے۔ یہ غلبہ کسی سازش یا ظلم کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ اُس زمانے میں مسلمان ایک صحت مند تہذیب لے کر اُبھرے تھے۔ ان کے ذریعہ لوگوں کو مساوات اور فکری آزادی جیسی صالح قدریں مل گئی تھیں۔ تاہم اِسی کے ساتھ یہ ہوا کہ مسلمان اُس وقت کی دنیا کے لیے جب نافع بنے تو عین فطری قانون کے مطابق، وہ دنیا کے اوپر حاکم بھی بن گئے۔

اس معاملے میں جدید دَور کے مسلمانوں کو اس غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے بہت نقصان پہنچا۔ وہ مغربی قوموں سے نفرت کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں وہ انگریزی زبان اور جدید سائنس کے حصول میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگیے۔ اس بنا پر وہ مغربی قوموں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جدید قومیں جن عُلوم کو لے کر اُبھری تھیں وہ علوم اسلام کے لیے بے حد مفید تھے۔ یہ گویا دَورِ جدید کا ''علم کلام'' تھا۔ لیکن مغرب کے خلاف تعصب کی بنا پر مسلمانوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا اور اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں ناکام رہے۔

الرسالہ مشن کے سامنے اوّل دن سے یہ نشانہ تھا کہ مغرب کے خلاف اس غیر فطری تعصب کو ختم کیا جائے تاکہ مسلمان جدید قوتوں کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے کے قابل ہوسکیں۔ ابتدا میں یہ کام بہت مشکل تھا، مگر اب خدا کے فضل سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں ایک نیا رُجحان اُبھرا ہے۔

انھوں نے جدید چیزوں کو اسلام کے حق میں استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ مثال کے طور پر میری کتاب ''علم جدید کا چیلنج'' پہلی بار جب ۱۹۶۶ میں شائع ہوئی تو وہ اسلام اور سائنس کے موضوع پر پورے عالم اسلام کی پہلی کتاب تھی۔ جب کہ آج اس موضوع پر سیکڑوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے اکثر غیر معیاری ہیں۔

۲۰۰۱ میں الرسالہ مشن ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ میں نے جنوری ۲۰۰۱ میں اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر سنٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی CPS (Center for Peace and Spirituality) قائم کیا۔ اِس ادارے کا خاص مقصد اسلام کا عمومی تعارف تھا۔

CPS کا مقصد Peace اور Spirituality کو فروغ دینا ہے۔ یہ کام بہت پہلے سے کیا جارہا تھا۔ مگر جنوری ۲۰۰۵ میں اس کو ایک مستقل نام کے ساتھ شروع کیا گیا۔

Peace اور Spirituality دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ داخلی انسانی سطح پر جس چیز کو Spirituality کہا جاتا ہے اسی کے خارجی اظہار کا نام Peace ہے۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ Peace اور Spirituality صحت مند سماج اور بیٹر ہیومن لائف (better human life) بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ مگر عام طور پر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ کیا جاتا ہے کہ crowd کو address کیا جاتا ہے۔ مگر اس عمل کا starting point کبھی crowd نہیں بن سکتا۔ روحانی بیداری کے مقصد کو حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ individual مائنڈ کو address کیا جائے۔ اس معاملے میں پہلا کام یہ ہے کہ انفرادی ذہن کی تشکیل نو کرکے افراد کی ایک ٹیم بنائی جائے۔ پھر افراد کی اس ٹیم کو سماج کی نئی تشکیل و تنظیم کے لیے استعمال کیا جائے۔

CPS اسی نظریہ کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے تعلیم یافتہ افراد کو تیار کیا جارہا ہے تاکہ یہ تربیت یافتہ افراد سوسائٹی کے مختلف طبقات تک پہنچیں اور اس طرح کسی بڑے حقیقی انقلاب کا باعث بنیں۔

اس مقصد کے لیے CPS کے تحت، دہلی میں اسپر یچول کلاس قائم کیا گیا جو خدا کے فضل سے غیر متوقع حد تک کامیاب رہا۔

اس کے آغاز کی کہانی بہت سبق آموز ہے۔ دہلی کے کچھ ہندو نوجوان (رَجت ملہوترا، پِر یا ملک وغیرہ) یہ لوگ انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور کئی سال سے سچائی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ پہلے وہ مختلف فلسفوں اور مختلف مذہبوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ آخر میں وہ اسلام کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے۔ کسی نے اُن کو مشورہ دیا کہ تم دہلی میں جماعتِ اسلامی کے مرکز میں جاؤ۔ وہاں تم کو اسلام پر انگریزی لٹریچر پڑھنے کے لیے ملے گا۔ چنانچہ وہ جماعت اسلامی کے امیر ڈاکٹر عبدالحق انصاری سے ملے، اور اُن سے اسلام پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر انصاری نے ان کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے انگریزی ترجمے دیے۔

ان انگریزی کتابوں کے پڑھنے کے بعد یہ ہندو نوجوان دوبارہ ڈاکٹر انصاری سے ملے۔ انھوں نے ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ آپ کی دی ہوئی کتابیں ہم نے پڑھ لیں، مگر یہ کتابیں ہمارے مائنڈ کو ایڈریس نہیں کرتیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کو خطاب کرتی ہیں، ہمارے جیسے لوگ جو سچائی کے متلاشی ہیں، ان کے لیے یہ کتابیں مفید نہیں۔

یہ گفتگو جماعت اسلامی کے مرکز میں امیر جماعت کے آفس میں ہوئی۔ اُس وقت جماعت اسلامی کے مرکزی سکریٹری وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ہندو نوجوانوں کی یہ ساری باتیں سنیں اور پھر اُن سے کہا کہ آپ کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا مسلم دنیا میں صرف ایک ہی آدمی ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے میرا نام بتایا۔ چنانچہ یہ ہندو نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے میری کتابیں پڑھیں اور ہمارے اسپر یچول کلاس سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے۔

اسپر یچول کلاس کے بارے میں کچھ باتیں ماہنامہ الرسالہ میں چھپتی رہی ہیں۔ یہ اسپر یچول کلاس حقیقتاً اسلامی کلاس ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، جدید دَور میں اس قسم کی کلاس پہلی بار قائم ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ ساری مسلم دنیا (بشمول عرب) میں مختلف ناموں کے ساتھ حلقے قائم ہوتے رہے

ہیں۔ مگر یہ تمام حلقے دو قسم کے موضوعات کی بنیاد پر قائم ہوئے—روایتی موضوعات، یا قومی موضوعات۔ مثلاً عرب دنیا میں اسرئیل کا مسئلہ پیدا ہوا تو جگہ جگہ ایسے حلقے قائم ہوگئے جہاں لوگ جمع ہوکر اسرائیل کے مسئلے پر گفتگو کرتے تھے۔ اسی طرح پاکستان میں جب سیکولر مسلمان پاکستان کے حاکم بن گئے تو وہاں کے اسلام پسند لوگ مختلف ناموں کے تحت اکھٹا ہوکر اُن کے خلاف سیاسی مذاکرے کرنے لگے۔

اسپر پیچول کلاس کا مقصد اس کے برعکس یہ تھا کہ آج کا تعلیم یافتہ طبقہ، ہندو اور مسلمان دونوں جس فکری مستویٰ (intellectual level) پر اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے، اس فکری مستویٰ پر اسلام کو اُس کے لیے قابلِ فہم بنانا۔ جو لوگ اسپر پیچول کلاس میں برابر شریک ہوتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ میری فکر کو انھوں نے میری تحریروں سے اُتنا نہیں سمجھا تھا، جتنا کہ اسپر پیچول کلاس میں میری باتیں سُن کر سمجھا۔ یہ اسپر پیچول کلاس وہی ہے جس کو روایتی الفاظ میں ''صُحبت'' کہا جاتا ہے۔ صحبت کی صورت میں مسائل کی وضاحت جس طرح ہوتی ہے، تحریر کے ذریعے اُس طرح ممکن نہیں۔

اسپر پیچول کلاس کے تمام ممبران انگریزی خواں لوگ تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ انگریزی کی اچھی تعلیم پائے ہوئے ہوتے ہیں، کم از کم میرے لیے اُن کے سامنے اسلام کی وضاحت زیادہ آسان ہوتی ہے۔ جو لوگ روایتی انداز میں اسلام کو سمجھتے ہیں یا روایتی انداز میں کلام کرتے ہیں۔ اُن کا معاملہ اس سے مختلف ہوسکتا ہے۔ لیکن میں چوں کہ اسلام کو جدید تقاضوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے میرا ایک خاص اسلوب بن گیا ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، یہ اسلوب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے زیادہ قابلِ فہم ہوتا ہے۔

اسپر پیچول کلاس کا طریقہ شروع ہی سے یہ رکھا گیا کہ اُس کا ہر ممبر اپنے ساتھ ڈائری رکھتا ہے اور تمام باتوں کو نوٹ کرتا ہے۔ تمام لوگ اپنی ڈائریاں انگریزی میں لکھتے ہیں۔ اس طرح ڈائریوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا ہے۔ آئندہ کسی وقت مرتب کرکے اُس کو کتاب کی صورت میں شائع کیا جاسکتا ہے۔

مئی ۲۰۰۵ سے اس میں یہ اضافہ ہوا کہ ٹیم کے ایک ممبر نے بطور خود یہ کیا کہ وہ اپنے ساتھ کمپیوٹر (لیپ ٹاپ) لاتے ہیں اور جب میں کسی موضوع پر بولتا ہوں تو ساتھ ساتھ وہ اس کو انگریزی میں ٹائپ کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ لوگ بدستور کلاس کی باتوں کو ہاتھ سے لکھتے ہیں، اور ایک صاحب اس کو کمپیوٹر پر ریکارڈ کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ٹیم کے ایک ممبر نے یہ کام شروع کیا ہے کہ وہ لوگوں کی پچھلی تمام ڈائریوں کو پڑھ کر اُس کو ایڈٹ کررہے ہیں اور پھر اُس کو کمپیوٹر پر ٹائپ کررہے ہیں۔

اسپریچول کلاس کے دوران ایک اور تجربہ یہ ہوا کہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ تزکیہ (البقرہ ۱۲۹) کیا ہے۔ جب لوگ اس ہفتے واری کلاس میں آئے تو مجھ سے گفتگو کے دوران یہ معلوم ہوا کہ ہر آدمی ایک کنڈیشنڈ مائنڈ (conditioned mind) ہے اور وہ اُسی میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے گھر، اپنے ماحول اور اپنے اختلاط کے دَوران جو کچھ دیکھتا اور سُنتا ہے اُس سے مسلسل طور پر اُس کا ذہن بنتا رہتا ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی فطری حالت پر ہوتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو مکمل طور پر ایک کنڈیشنڈ انسان ہوتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ اُس پر ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کا عمل کیا جائے۔

تزکیہ دراصل اسی ڈی کنڈیشننگ کا نام ہے۔ تزکیہ کے لفظی معنٰی ہیں: پاک کرنا (purification)۔ روایتی طور پر اس کو تزکیۂ قلب کے معنٰی میں لیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مُراد تزکیۂ ذہن ہے۔ آدمی کا ذہن ہی اُس کے تمام افعال کا مرکز ہے۔ ذہنی سطح پر بگڑی ہوئی سوچ کو دوبارہ صحیح سوچ بنانا، اسی کا نام تزکیہ ہے اور اسی کے ذریعے فکری اور عملی اعتبار سے وہ شخصیت بنتی ہے جس کو روحانی شخصیت یا ربّانی شخصیت کہا جاتا ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ لوگ عام طور پر کنفیوژن میں جیتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہمارے اسپریچول کلاس میں آئے۔ وہ ایک انٹرنیشنل امریکن کمپنی میں مینیجر ہیں۔ یہاں، امریکی اصول کے مطابق، ہایر اینڈ فائر (hire and fire) کا اصول رائج ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلسل تناؤ میں رہتا ہوں۔ ہر وقت جاب کھونے کا اندیشہ (fear of losing job) میرے دماغ پر چھایا

رہتا ہے۔ میں نے نصیحت کے طور پر اُن کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

One can take away your job. But no one has the power to take away your destiny.

تزکیہ کو عام طور پر تزکیۂ قلب کے ہم معنٰی سمجھا جاتا ہے اور روایتی تصور کے مطابق، تزکیۂ قلب کا ذریعہ صوفیانہ اوراد و وظائف ہیں۔ جب کوئی شخص اِن اوراد و وظائف میں زیادہ مشغول ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی کیفیت کو عام طور پر تزکیہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک بے اصل بات ہے۔ یہ قلبی کیفیت جو پیدا ہوتی ہے وہ دراصل وَجْد (ecstacy) ہے۔ اور وجد کا کوئی بھی تعلّق تزکیۂ رُوحانی سے نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں انسانی فکر کے دو دَور ہیں — قبل سائنس دَور، اور بعد سائنس دَور۔ قبل سائنس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ قلب جذباتِ انسانی کا مرکز ہے۔ اس لیے صوفیا نے تزکیۂ روحانی کے لیے قلب کو مرکز بنایا۔ اور سالکینِ طریقت کے لیے مبنی بَر قلب وظائف تجویز کیے۔ ان وظائف میں اشتغال سے چوں کہ سالکین کو وَجد کی سی ایک کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اسی وجد کو غلط طور پر معرفت سمجھ لیا، حالاں کہ معرفت ایک شعوری حالت ہے، جب کہ وَجد صرف ایک مجہول احساس کا نام ہے۔ اِس غلط فہمی کی بنا پر سمجھ لیا گیا کہ یہ طریقہ حُصولِ تزکیہ کے لیے مفید ہے۔ مگر وجد کی کیفیت سرتاسر ایک غیر متعلق کیفیت ہے جو ہندو طریقے پر میڈیٹیشن (meditation) کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے۔

بعد سائنس دور میں یہ نظریہ متروک ہو چکا ہے۔ اب انسان کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ فکر وجذبات اور احساس کا مرکز تمام تر ذہن (mind) ہے۔ اس لیے تزکیہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ذہن کی تفکیری اصلاح کی جائے۔ یہی تزکیہ کا اصل طریقہ ہے۔ اسپریچول کلاس میں اسی طریقِ تزکیہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ ایک صوفی سے پوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تصوف کا مطلب تصور ہے۔ میرے نزدیک قرآن کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ تصوف کا مطلب تَوَسُّم (الحجر ۷۵) ہے۔

توسم کا مطلب ہے، مادّی تجربات کو معرفت میں ڈھال لینا:

Translating material events into spiritual experience.

روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ معرفت کا ذریعہ صحبت ہے۔ یعنی کسی بزرگ کے پاس بیٹھنے سے پُراسرار طور پر آدمی کے اندر ربّانی معرفت پیدا ہوجاتی ہے۔ گویا کہ حصول معرفت کا ذریعہ صرف کسی بزرگ کی صحبت ہے نہ کہ تدبر وتفکر اور ذاتی محنت۔ یہ نظریہ مزاجِ اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام کے مطابق، ہر آدمی اس دنیا میں حالتِ امتحان میں ہے۔ اس دنیا کے لیے خدائی قانون یہ ہے کہ: **لیس للإنسان إلا ما سعی** (النجم ۳۹) ایسی حالت میں یہ ماننا کہ ذاتی عمل کے بغیر صرف کسی کی صحبت سے روحانیت یا ربّانیت حاصل ہوسکتی ہے، ایک متضاد نظریہ ہے۔ کیوں کہ یہ نظریہ اُس حکمت کی نفی کررہا ہے جس کو امتحان کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو، ربّانی بنو (**کونوا ربّانیین**، آل عمران ۷۹) ربّی کے لفظی معنٰی ہیں: رب والا۔ ربّانی اسی کا مبالغہ ہے۔ یعنی بہت زیادہ رب والا۔ ربّی یا ربّانی کو دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مُراد ہے: خدا رُخی سوچ (God oriented thinking) یا خدا رُخی زندگی (God oriented life)۔ یعنی انسان کی وہ حالت جب کہ اس کی سوچ کا مرکز خدا بن جائے، جب کہ اس کے جذبات واحساسات پر تمام تر خدا کا غلبہ ہوجائے، جب کہ خدا کی یاد اس کی ہستی میں پوری طرح سما جائے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو روحانیت (spirituality) کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے اکثر شعبوں کی طرح، روحانیت کے دو دور ہیں — قبل سائنس دور (pre-scientific era) اور بعد سائنس دَور (post-scientific era)۔ قبل سائنس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جذبات واحساسات کا مرکز قلب (heart) ہے۔ چنانچہ اُس زمانے میں رُوحانیت کے حصول کا ذریعہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ قلب پر فوکس ڈال کر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ سادھوؤں کا میڈیٹیشن (meditation) اور صوفیوں کا مُراقبہ اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے۔

مگر بعد سائنس دور میں یہ نظریہ بے بنیاد ثابت ہوگیا۔ اب متفقہ طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ قلب صرف گردشِ خون (sirculation of blood) کا ذریعہ ہے۔ سوچ اور احساسات کا مرکز تمام تر انسان کا دماغ ہے۔ سرجری کی ترقی کے بعد یہ کیا گیا کہ آپریشن کرکے انسان کے قلب کو اس کے سینے سے نکال لیا گیا اور اس کی جگہ پیس میکر (pace maker) لگا دیا گیا جو مصنوعی طور پر خون کو پمپ کرنے کا کام کررہا تھا۔

آپریشن کے بعد اُس انسان کا سینہ قلب سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی سوچ اور اس کے احساسات ٹھیک ویسے ہی باقی رہے جیسا کہ وہ اُس وقت تھے جب کہ فطری قلب اس کے سینے میں موجود تھا۔ اس طرح کے آپریشن کے بعد یہ ثابت ہوا کہ فکر اور احساس کا مرکز مکمل طور پر دماغ ہے نہ کہ قلب۔

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں بھی قلب کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے گویا کہ دماغ کے علاوہ قلب بھی سوچ اور جذبات کا مرکز ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ قرآن میں ایسے مواقع پر قلب کا ذکر اس کے ادبی استعمال کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس کے سائنسی مفہوم کے اعتبار سے۔

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قرآن میں سوچ کے عمل کے لیے صرف قلب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ عقل اور لُبّ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ قرآن میں تقریباً ۶۵ بار استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو بالواسطہ طور پر دماغی عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً توسّم اور تفکر وغیرہ۔

اس کے علاوہ قرآن میں جس مفہوم کے لیے قلب کا لفظ آیا ہے ٹھیک اُسی مفہوم کے لیے متعدد آیتوں میں سَمع اور بَصر کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً: **لهم قلوب لا يفقهون بها، ولهم أعين لايبصرون بها، ولهم اٰذان لا يسمعون بها** (الاعراف ۱۷۹)

اگر اس طرح کی آیتوں کی بنیاد پر یہ مانا جائے کہ سوچ کے عمل کا تعلق قلب سے ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آنکھ اور کان کا تعلق بھی سوچ سے ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں میں دیکھنے اور سننے کے جس عمل کا

ذکر ہے اس سے مراد سادہ طور پر کیمرہ یا ٹیپ ریکارڈر کی طرح دیکھنا اور سننا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ دیکھنا اور سُننا ہے جس میں سوچ بھی شامل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جہاں عقل اور لُبّ کا حوالہ ہے وہاں اُس سے براہِ راست دماغی عمل مراد ہے اور جہاں آنکھ، کان اور دل کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہ الفاظ اپنے معروف ادبی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح بعد سائنس دَور میں تصوف یا رُوحانیت کا علم پوری طرح بدل گیا ہے۔ اب رُوحانیت کا تعلق قلبی وظائف سے نہیں بلکہ اس کا تعلق ذہنی ارتقا کے ایک خاص مرحلے سے ہے۔

اسپریچول کلاس میں میں نے اسی اصول پر لوگوں کا تزکیہ کیا اور ان کے اندر روحانیت لانے کی کوشش کی۔ خدا کے فضل سے نتیجہ صد فی صد کامیاب رہا۔ ہمارے کلاس میں ایسے کئی افراد شریک ہوئے جنھوں نے بتایا کہ وہ برسہا برس تک ہندو گروؤں اور مسلم صوفیوں کے یہاں روحانیت کے حصول کی کوشش کرتے رہے مگر انہیں روحانیت نہیں ملی۔ جب کہ ہمارے کلاس میں اُن کو اپنی مطلوب رُوحانیت حاصل ہوگئی۔

الرسالہ مشن میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ لمبی تحقیق اور مطالعے کے بعد اسلام کو میں نے گویا ازسرِ نو دریافت کیا۔ مگر یہ دریافت میرے لیے کوئی آسان کام نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دریافت تک پہنچتے پہنچتے میں اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ اپنے خیال کے مطابق، میرے پاس فکرِ صحیح کا سرمایہ تھا مگر اس فکر کے مطابق عمل کرنے کے لیے میرے پاس اُن چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی جو کسی نئے مشن کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُس زمانے میں میری جو نفسیات تھی اُس کا اندازہ میری کتاب ''الاسلام'' کے ابتدائی صفحے سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ صفحہ میں نے ستمبر ۱۹۷۵ میں لکھا تھا۔ اُس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اِس کتاب کو لکھ کر مَر جاؤں گا اور شاید میری زندگی میں اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ کتاب کی ان تمہیدی سطروں میں میں نے ایک ناول کی کہانی نقل کی تھی۔ یہ ایک انسان کی کہانی تھی جو سچائی کی تلاش میں تھا، اور آخر میں عین اُس وقت مر گیا جب کہ اُس نے فکری طور پر سچائی کو دریافت کرلیا

تھا۔اس کہانی کو نقل کرنے کے بعد میں نے لکھا تھا:

''یہ کتاب میری طویل تلاش کا جواب ہے۔میں شاید نظریاتی چٹّان کی سیڑھیاں کاٹ چکا تھا کہ میرے سامنے دوسرا پہاڑ آ کر کھڑا ہو گیا۔اب ضرورت تھی کہ دریافت کردہ حقیقت کی روشنی میں اسلام کی مہم کو عملی طور پر چلایا جائے۔مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری طاقت ختم ہوگئی۔ماضی کی شدید جدوجہد نے مجھے قبل از وقت بوڑھا بنا دیا۔''نظریاتی سیڑھیاں'' کاٹنے میں میں نے اپنی عمر تمام کردی۔اب ''عملی سیڑھیاں'' کس طرح کاٹوں۔تاہم میرے اطمینان کے لیے کافی ہے کہ میں نے سچائی کو کم از کم فکری طور پر دریافت کرلیا۔اب شاید میں یہ کہتے ہوئے مرسکتا ہوں کہ — میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی''۔(صفحہ ۵)

تاہم خدا کی مدد شامل حال ہوئی اور میری دریافت ایک مشن بن کر ہر طرف پھیل گئی۔اور وہ مسلسل پھیلتی جارہی ہے۔مخالفتوں کے طوفان کے باوجود یہ سفر پوری طرح جاری ہے۔بظاہر اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اسی طرح جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

آخر میں میں اپنے ایک احساس کا ذکر کروں گا۔یہ احساس صحیح ہے یا غلط، اس کا فیصلہ صرف خدا کرسکتا ہے۔تاہم میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میں اپنے اس احساس کو یہاں درج کروں۔ایک مشہور روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پچھلے اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور امتِ مسلمہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ان میں سے ۷۲ فرقے آگ والے ہیں۔صرف ایک جنت والا ہے۔یہ ایک فرقہ ''الجماعت'' ہے (ابوداؤد) ''الجماعت'' سے کیا مُراد ہے۔اس کی تشریح ترمذی کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔صحابہ نے پوچھا: اے خدا کے رسول! یہ الجماعت کون لوگ ہیں۔آپ نے جواب دیا: جو اُس پر ہو جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (من کان علی ما أنا علیه و أصحابی)

یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر سیکڑوں تحریکیں اُٹھیں، مگر غالباً الرسالہ مشن ہی واحد مشن ہے جس کے بارے میں سب سے زیادہ یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ ''اکابر'' پر تنقید کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اَسلاف سے بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے کسی ناقد نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن وحدیث سے ہٹے ہوئے ہیں، یا ہماری تحریروں کے پڑھنے سے نعوذ باللہ رسول اور اصحاب رسول سے بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ الرسالہ مشن صرف قرآن وسنّت اور اسوۂ صحابہ کو حق کا معیار سمجھتا ہے۔ بالفاظ دیگر، گویا خود ہمارے ناقدین کی شہادت کے مطابق، وہ **ما انا علیه و اصحابی** کا مصداق ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور اصل معاملے پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات خود اپنی زبان سے یہ اعلان کررہے ہیں کہ الرسالہ مشن ''**ما أنا علیه و أصحابی**'' کے اصول پر قائم ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے دوسرے مشن اپنے مفروضہ اکابر کے دین پر قائم ہیں۔ اس معاملے کو منطقی حد تک لے جائے بغیر میں کہوں گا کہ ہمارے ناقدین ہم کو ایک ایسا سرٹیفکٹ دے رہے ہیں جس سے بڑا کوئی سرٹیفکٹ بلاشبہہ اس دُنیا میں نہیں ہوسکتا۔

جدید تعلیم یافتہ مسلمان

میں جس دور میں پیدا ہوا اور جس مسلم ماحول میں میری پرورش ہوئی، وہ مغربی تعلیم کے بارے میں منفی سوچ میں مبتلا تھا۔ ہر لکھنے اور بولنے والا مسلمان انگریزی تعلیم یا مغربی تعلیم کو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بتاتا تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کو ڈی اسلامائز کرنے کی ایک سازش ہے۔ اقبال (وفات: ۱۹۳۸) کی پوری شاعری مغربی تعلیم اور تہذیب کے بارے میں صرف منفی ذہن بناتی ہے۔ اکبرالہ آبادی (وفات: ۱۹۲۱) نے اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبرالہ آبادی کا یہ شعر آزادئ ہند (۱۹۴۷) سے پہلے کے دَور میں اتنا زیادہ مشہور ہوا کہ ہر جگہ اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (وفات: ۱۹۷۹) نے اس نقطۂ نظر کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ''برٹش حکومت نے انڈیا میں کالج اور یونیورسٹی کا جو تعلیمی نظام قائم کیا ہے، وہ مسلمانوں کے لیے قتل گاہ کی حیثیت رکھتا ہے''۔ بیسوی صدی کے وسط میں ڈاکٹر رفیع الدین (وفات: ۱۹۶۹) کی مشہور کتاب ''قرآن اور علم جدید'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا کہ موجودہ زمانے کے وہ مسلمان جنھوں نے جدید طرز کی مغربی تعلیم پائی ہے، وہ ایک قسم کے ذہنی ارتداد میں مبتلا ہیں۔ یہ نقطۂ نظر مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی (وفات: ۱۹۹۹) نے اس کی تائید میں ایک تقریر کی جو عربی زبان میں ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس پمفلٹ کا نام تھا: **ردّة و لا ابابکر لها** (ایک ارتداد ہے، مگر اس سے مقابلے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں)۔

مغربی طرز کی تعلیم سے جو مسئلہ پیدا ہوا، اس کے خلاف تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان اسی قسم کی منفی رائے زنی کررہے تھے۔ کسی نے بھی گہرائی کے ساتھ اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں لمبی مدت تک اس موضوع پر مطالعہ کرتا رہا اور دعائیں کرتا رہا۔ آخر کار خدا کی توفیق سے مجھ پر یہ بات

کھلی کہ یہ معاملہ ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) کا نہیں ہے بلکہ وہ ذہنی عدم اطمنان (intellectual discontent) کا معاملہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیکڑوں سال سے اسلام کو ایک خاص روایتی انداز میں پیش کیا جارہا تھا۔ قبل سائنس دور (pre-scientific era) میں یہ روایتی اسلوب لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ کیوں کہ لوگوں کا طرز فکر بھی روایتی تھا، اور تفہیم کا اسلوب بھی روایتی۔ مگر بعد سائنسی دور (post-scientific era) میں یہ صورتِ حال بدل گئی۔ اب یہ ہوا کہ جدید تعلیم مسلمانوں کا ذہن سائنسی انداز میں سوچنے لگا۔ مگر اسلام کی نمائندگی کرنے والے لوگ بدستور قدیم روایتی انداز میں اسلام کو پیش کررہے تھے۔ قدیم روایتی اسلوب، جدید سائنسی ذہن کو ایڈریس کرنے میں ناکام رہا۔ قدیم اسلوب اور جدید ذہن کے درمیان یہی فکری بُعد (intellectual gap) مذکورہ مسئلے کی اصل جڑ ہے۔

مسئلے کی نوعیت کی اس دریافت کے بعد میں نے اپنی زندگی کا یہ مشن بنایا کہ مجھے اسلام کی تعلیمات کو دوبارہ عصری اسلوب میں پیش کرنا ہے، تاکہ آج کا ذہن اسلام کی صداقت پر مطمئن ہوسکے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب قرآن اور علم جدید میں صرف مسئلہ بتایا گیا تھا۔ میں نے اس مسئلے کے حل کے طور پر ایک جامع کتاب تیار کی۔ یہ کتاب اردو زبان میں علمِ جدید کا چیلنج کے نام سے پہلی بار ۱۹۶۶ میں چھپی۔ بعد کو یہ کتاب مذہب اور جدید چیلنج کے نام شائع ہوئی۔ یہ کتاب عربی زبان میں **الاسلام یتحدّی** کے نام سے شائع کئی گئی ہے اور انگریزی میں God Arises کے نام سے۔ اسی طرح دوسری کئی زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کیے گیے۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ میری تقریباً تمام تحریریں اور تقریریں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ میری تمام سرگرمیوں کو اسی ایک عنوان کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔

دعوت کے دو محاذ

اسلام میں ایک کام وہ ہے جس کو اصلاحِ امت کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا کام وہ ہے جس کے لیے دعوت یا تبلیغ کے الفاظ آئے ہیں۔ اصلاحِ امت ایک داخلی کام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر

زمانے میں اور ہر اگلی نسل میں امت کی اصلاح کا کام جاری رکھا جائے۔ امت میں جس قسم کا بگاڑ ہو اس کے مطابق، اس کی اصلاح کی منصوبہ بندی کی جائے۔

دعوت یا دعوت الی اللہ، اس کے مقابلے میں ایک خارجی عمل ہے۔ دعوت کا عمل ان لوگوں کے اوپر انجام دینا ہے جو ابھی اسلام کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان لوگوں کی نسبت سے دعوت کا کام یہ ہے کہ انھیں اسلام کی صداقت پر مطمئن کیا جائے۔ ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کی جائے کہ وہ سچائی کو اسلام میں دریافت کرسکیں۔ وہ اسلام کو اپنا دین بنا سکیں، اور اس طرح وہ خدا کی ابدی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں۔

موجودہ زمانے میں دعوت کے اس عمل کے دو محاذ ہیں۔ ایک، وہ لوگ جو غیر مسلم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ جو ابھی تک اسلام کے دائرے میں داخل نہیں ہوئے۔ لیکن موجودہ زمانے میں دعوت کے عمل کا ایک اور محاذ بن گیا ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے محاذ سے کم نہیں۔ یہ وہ پیدائشی مسلمان ہیں جن کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ بظاہر اگرچہ مسلم قوم میں شامل ہیں، وہ کم وبیش مسلم کلچر کو اپنائے ہوئے ہیں، حتّٰی کہ وہ علماء کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتے ہیں۔ مگر اندر سے اسلام پر ان کا یقین متزلزل ہو گیا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر شک کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ عملی طور پر دیکھیے تو ان کا کیس پہلی قسم کے لوگوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔

پاکستان کے ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' میں ایسے لوگوں کا حوالہ دیا تھا، اور کہا تھا کہ یہ لوگ اگرچہ بظاہر مسلمان ہیں مگر عملاً وہ ایک قسم کے ذہنی ارتداد میں مبتلا ہیں۔

مسلمانوں میں ذہنی ارتداد کی یہ نشاندہی بجائے خود درست ہے۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اور اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں سائنٹفک انقلاب نے تمام معیارات بدل دیے۔ ہر چیز پر نیے انداز سے تحقیق ہونے لگی۔ ہر چیز کی صحت نئی کسوٹی پر جانچی جانے لگی۔ ہر علم کو پھر سے مدوّن کیا جانے لگا۔

مثال کے طور پر قبل سائنسی دور میں قیاسی منطق کا رواج تھا، بعد سائنس دور میں سائنسی منطق کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ پہلے مذہبی تعلمات کو عقیدے کی بنیاد پر مانا جاتا تھا، اب مذہبی تعلیمات کو عقل

کی بنیاد پر ماننے کا مطالبہ ہونے لگا، وغیرہ۔ اس فرق کو ذہنی فریم ورک کا فرق کہا جاسکتا ہے۔ اسی فرق کی بنا پر مذکورہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ آج کا انسان جس فریم ورک میں باتوں کو سمجھتا ہے، اس فریم ورک میں اسلام کی تعلیم اس کو نہیں پہنچائی گئی۔ اس فرق کی بنا پر لوگوں کے اندر شک وشبہے کی نفسیات پیدا ہوگئی۔

اس مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ فتوے کی زبان میں ان کو مرتد یا فاسق یا زندیق کہا جائے۔ اس کے برعکس یہ ہونا چاہیے کہ ان کے کیس کو متلاشیٔ حق کا کیس سمجھا جائے اور عصری دلائل کے ذریعے ان کے ذہن کو مطمئن کیا جائے۔

غور کیجیے تو خود ان لوگوں کا کیس بھی یہی ہے جن کو معروف طور پر کافر (منکر) کہا جاتا ہے۔ ایک بیرونی سفر میں میری ملاقات جاپان کے ایک نومسلم سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جاپان کے لوگ سادہ اور حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اصل فطرت پر قائم ہیں۔ اسلام جو کہ دین فطرت ہے اس کو جاپانیوں کے سامنے پیش کیا جائے تو بہت جلد وہ اس کی صداقت کا ادراک کرلیں گے اور اپنے آپ کو اس کے ماننے پر مجبور پائیں گے۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جاپانی عوام امکانی طور پر مسلمان ہیں:

Japanese are potentially Muslims.

میں سمجھتا ہوں کہ یہی بات ان تمام لوگوں پر صادق آتی ہے جن کو عام طور پر کافر کہا جاتا ہے۔ میرے نزدیک لوگوں کو مسلم اور کافر میں تقسیم کرنا درست نہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح تقسیم یہ ہے کہ لوگوں کو مسلم اور متلاشیٔ حق میں تقسیم کیا جائے۔ کیوں کہ پیدائش کے اعتبار سے ہر شخص ایک ہی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے (الروم: ۳۰) اس حیثیت سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تمام انسان امکانی طور پر مسلم ہیں:

Every human being is potentially Muslim.

انسان کے بارے میں یہی نقطۂ نظر داعیانہ نقطۂ نظر ہے۔ داعی ہر ایک کے بارے میں یہی پُر امید احساس رکھتا ہے۔ یہی پُر امید احساس داعی کی اصل طاقت ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو داعی کبھی معتدل

طور پر دعوت کے بارے میں اپنی ذمّے داری کو انجام نہیں دے سکتا۔

اس معاملے میں میرا تجربہ بھی یہی ہے۔ میں نے زیادہ تر اپنا کام غیر مسلموں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کیا ہے، تحریر کے ذریعے بھی اور تقریر و گفتگو کے ذریعے بھی۔ اس لحاظ سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان دونوں طبقے کے لوگوں کا ذاتی تجربہ کیا ہے۔ میرا یہ تجربہ ہندستان کے لوگوں کی نسبت سے بھی ہے اور دوسرے ملکوں کی نسبت سے بھی۔ میں نے یہ تجربہ اہلِ مشرق کے درمیان بھی کیا ہے اور اہلِ مغرب کے درمیان بھی۔

میں اپنے اس تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہہ یہ بات درست ہے کہ وہ لوگ جن کو غیر مسلم کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت متلاشیٔ حق ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے موجودہ عقیدے پر غیر مطمئن ہے۔ ان میں سے ہر ایک نئی زیادہ قابلِ یقین سچائی کو جاننا چاہتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کا ذہنی شاکلہ، قدیم انسانی شاکلے سے مختلف ہے۔ اگر ان کے اپنے شاکلے کے مطابق، انھیں اسلام کا پیغام پہنچایا جائے تو ان میں سے بہت سے لوگ یقیناً اِس پیغام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔

جہاں تک جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کا کیس بھی یہی ہے۔ یہ لوگ ذہنی انحراف میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ ذہنی عدم اطمینان کی حالت میں مبتلا ہیں۔ اگر ان کے اپنے ذہنی شاکلے کے مطابق، انھیں حق کا پیغام پہنچایا جائے تو یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کو اپنے لیے حق کی ری ڈسکوری سمجھیں گے اور کھلے دل کے ساتھ اس کو قبول کرلیں گے۔

دعوتی سفر

میں ایک پیدائشی داعی ہوں۔ دعوت ہمیشہ سے میرا نشانہ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ میں جب کہ ابھی میں پختہ عمر کو نہیں پہنچا تھا، میں نے قرآن کے ایک لفظ کو لے کر من أنصاری إلی اللّٰہ کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ پھر اس کام کے لیے ادارۂ اشاعتِ اسلام کا نام اختیار کیا۔ اُس وقت میں اپنی فیملی کے ساتھ اعظم گڑھ میں رہتا تھا۔ اُس زمانے میں میں نے کئی چھوٹی کتابیں شائع کی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام یہ تھا: نئے عہد کے دروازے پر (On the Threshold of a New Era)۔

میرا دعوتی سفر مختلف صورتوں میں مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۶ میں میں نے دہلی سے ماہنامہ الرسالہ جاری کیا اور اسلامک سنٹر قائم کر کے اس کے تحت دعوتی کتابوں کی اشاعت شروع کی۔ اب خدا کے فضل سے ان دعوتی کتابوں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یہ کتابیں مختلف ملکی اور عالمی زبانوں میں شائع ہوئی ہیں۔ وہ جدید وسائلِ ابلاغ کے تحت ساری دنیا میں پھیل رہی ہیں۔

لمبے مطالعے اور تجربے کے بعد میں نے یہ سمجھا ہے کہ دعوتِ حق کا صحیح طریقہ وہ ہے جو انفرادی اپروچ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایک فرد کو بدلنا، ایک ایک ذہن کے اوپر ڈی کنڈیشننگ اور ری انجینئرنگ کا عمل کرنا۔ میرے مطالعے کے مطابق، یہی پیغمبروں کا طریقہ ہے۔ اس طریقِ کار کے دو مستند تاریخی نمونے ہیں۔ ایک کو مسیحی ماڈل اور دوسرے کو محمدی ماڈل کہا جا سکتا ہے۔

کسی تحریک کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے عوام کو خطاب کرنا، اور دوسرا ہے افراد کو خطاب کرنا۔ عوام سے خطاب کرنے کے لیے تحریک کو ایک عوامی اشو لینا پڑتا ہے، یعنی ایسا اِشو جس کے بارے میں پہلے سے عوام کے اندر شدید جذبات موجود ہوں۔ مثلاً برصغیر ہند میں ۱۹۴۷ سے پہلے مہاتما گاندھی کا بیرونی راج کے خلاف عوام کو پکارنا۔ یا محمد علی جناح کا ہندو خطرے کے خلاف مسلمانوں کو موبیلائز کرنا۔

اس طرح کی عوامی تحریک میں یہ ہوتا ہے کہ بہت جلد لیڈر کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی

ہے۔مگر ایسی کسی تحریک کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔ایسی تحریک تخریبِ غیر کے لیے تو مفید ہوتی ہے مگر وہ تعمیر خویش کے لیے بالکل مفید نہیں ہوتی۔

تحریک کا دوسرا طریقہ وہ ہے جو انفرادی اپروچ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔اس دوسرے طریقے میں سارا فوکس فرد کی اصلاح پر دیا جاتا ہے۔اس کا نشانہ افراد سے چل کر عوام تک پہنچنا ہوتا ہے، نہ کہ عوام کی بھیڑ اکھٹا کر کے افراد کو اپنے قبضے میں لینا۔

کسی مشن کے لیے کام کرنے کے دو طریقے ہیں۔ایک وہ جس کو سیاسی ماڈل کہا جاسکتا ہے اور دوسرا وہ جس کو روحانی ماڈل کہا جاسکتا ہے۔دونوں ہی کا مائنس پائنٹ اور پلس پائنٹ ہے۔

سیاسی ماڈل میں کراؤڈ کو ایڈریس کیا جاتا ہے۔اس میں ہمیشہ کسی ایسے منفی اشو کو لیا جاتا ہے جو خارجی ہو۔کیوں کہ کوئی خارجی اشو ہی کراؤڈ کا اشو بن سکتا ہے۔سیاسی ماڈل کا پلس پائنٹ یہ ہے کہ اس میں بہت جلد لوگوں کی بھیڑ اکھٹا ہو جاتی ہے۔لیکن سیاسی ماڈل کا مائنس پائنٹ یہ ہے کہ اس میں individual ذہن ایڈریس نہیں ہوتا۔اس لیے اس میں فرد کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی۔کمیاتی اعتبار سے مشن بہت بڑا دکھائی دیتا ہے لیکن کیفیاتی اعتبار سے وہ بالکل nill ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا ماڈل روحانی ماڈل ہے۔روحانی ماڈل میں فرد کے ذہن کو ایڈریس کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نہ کہ کسی کراؤڈ کو۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روحانی ماڈل، کے تحت بھیڑ اکھٹا نہیں ہوتی۔ البتہ اس میں فرد کی تعمیر گہرائی کے ساتھ ہوتی ہے۔مشن سے وابستہ ایک ایک فرد prepared mind اور purified soul بن جاتا ہے۔روحانی ماڈل، کوانٹٹی کے اعتبار سے بظاہر کم دکھائی دیتا ہے۔مگر کوالٹی کے اعتبار سے وہ بہت عظیم ہوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سیاسی ماڈل صرف تخریبی واقعہ وجود میں لاتا ہے۔جب کہ روحانی ماڈل تعمیری واقعے کو وجود میں لانے کا سبب بنتا ہے۔

الرسالہ مشن میں سیاسی ماڈل کو اختیار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس میں روحانی ماڈل کو اختیار کیا گیا ہے۔اس میں ساری کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ ایک ایک فرد کا ذہن بنایا جائے۔تیار افراد کی ایک ٹیم بنائی جائے۔ایسے افراد جن میں سے ہر شخص ایک طرف سنجیدہ ہو اور دوسری طرف وہ آرٹ آف تھنکنگ کو

بخوبی طور پر جانتا ہو۔ الرسالہ مشن کا فطری کورس یہ ہے کہ افراد کی ایک مضبوط ٹیم بنے اور پھر یہ ٹیم مشن کے پیغام کو وسیع تر انسانیت تک پہنچادے۔

مشہور سیرت نگار محمد بن اسحاق (وفات: ۷۶۸ء) نے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ الحدیبیہ (۶۲۳ء) کی ادائیگی کے بعد، اپنے منتخب اصحاب کو خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ: ''اللہ نے مجھے سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم میرے بارے میں اختلاف نہ کرو، جیسا کہ حواریوں نے عیسیٰ بن مریم سے اختلاف کیا۔ آپ کے اصحاب نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول! حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ: عیسیٰ بن مریم نے اُنھیں اس چیز کی طرف بلایا جس کی طرف میں نے تمہیں بلایا ہے۔ پس جس کو اُنھوں نے قریب کے علاقے کی طرف بھیجا تو وہ اس پر راضی ہوگیا اور اس کو مان لیا۔ اور جس کو انھوں نے دور کے علاقے کی طرف بھیجا تو وہ اس کو پسند نہیں آیا اور اُس نے گرانی محسوس کی۔ عیسیٰ بن مریم نے اللہ سے اس کی شکایت کی۔ تو جن لوگوں کو ناگواری ہوئی اُن کا حال یہ ہوا کہ اُن میں سے ہر ایک اس قوم کی زبان بولنے لگا جس کی طرف اس کو جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے کچھ قاصد بھیجے اور ان کو بادشاہوں کے نام مکتوب لکھ کر دیا۔ اس میں ان بادشاہوں کو اسلام کی طرف بُلایا گیا تھا۔ (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، ۲۷۸-۲۷۹)

مذکورہ روایت میں حضرت مسیح کے جس واقعے کا ذکر ہے، اُس کا ذکر قرآن میں بھی اجمالی طور پر آیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا: کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد کی۔ پس وہ غالب ہوگئے۔ (الصّف ۱۴)

جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے صلح الحدیبیہ کے بعد اطرافِ عرب کے تقریباً

ایک درجن حکمرانوں کو دعوتی خطوط لکھے اور اُنھیں اپنے سفیروں کے ساتھ متعلقہ حکمرانوں کی طرف روانہ کیا۔ ان حکمرانوں میں سے کچھ نے آپ کے مکتوب کا مثبت جواب دیا اور کچھ نے ان کو پڑھنے کے بعد منفی رویّہ اختیار کیا۔ اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے (ملاحظہ ہو، سیرت ابن کثیر، جلد ۳)

اس روایت سے دعوتی تحریک کا پیغمبرانہ ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ یعنی دعوتی مہم کا تین مرحلوں سے گذر کر اپنی تکمیلی منزل تک پہنچنا۔

۱۔ کسی بندۂ خدا پر حقیقت کا کھلنا، اس کا سچائی کو مکمل طور پر دریافت کرنا۔ اس طرح ایک عارف یا باخبر انسان کا وجود میں آنا۔

۲۔ پھر یہ انسان دوسرے کاموں کے علاوہ یہ کرتا ہے کہ وہ غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے افراد کی ایک ٹیم بناتا ہے۔ یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو حقیقت کا شعوری ادراک رکھتے ہیں۔ ان کے اندر مشنری اسپرٹ کمال درجے میں موجود ہوتی ہے۔ وہ گویا عارفینِ حق کا منتخب گروہ ہوتا ہے۔

۳۔ اس کے بعد یہ ٹیم اس پیغام کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور کمیونیکیشن کے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اُس کو تمام انسانوں تک پہنچا دیتی ہے۔

سہ گانہ مرحلے کی یہی ترتیب فطری ترتیب ہے۔ مسیحی ماڈل اور محمدی ماڈل دونوں اسی کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت مسیح کے زمانے میں اسی ترتیب سے کام ہوا۔ اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں بھی یہی تاریخ دہرائی گئی۔ یعنی ایک فرد سے کام کا آغاز، اور پھر ایک ٹیم کا بننا، اس کے بعد دعوت کی عمومی توسیع۔ یہ ترتیب دعوتی کام کی فطری ترتیب ہے۔ اس لیے یہی ترتیب بعد کے زمانے میں بھی اس کام کے لیے باقی رہے گی۔

الرسالہ مشن کے مستقبل کے بارے میں میں اکثر سوچتا تھا۔ ۱۲ مئی ۲۰۰۵ کی صبح کو میں اس موضوع پر غور وفکر کر رہا تھا کہ اچانک مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ دعوتی مشن بھی اسی فطری ترتیب کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل فطرت کے زیر اثر پہلے سے جاری تھا۔ مگر مئی ۲۰۰۵ میں اس واقعے کو میں نے شعوری طور پر دریافت کیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، میں نے اپنا دعوتی مشن ۱۹۵۰ء میں شروع کیا تھا، اس کے بعد وہ مختلف مراحل سے گذرتا رہا۔ تحریر وتقریر کے ایک مسلسل عمل کی صورت میں وہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس تحریک کی پشت پر ایک طاقت ور لٹریچر تیار ہوگیا۔ یہ لٹریچر اسلام کے تمام پہلوؤں کو عصری اسلوب میں بیان کرنے والا تھا۔

اس کے بعد تیسرا تاریخ ساز واقعہ یہ ہوا کہ جنوری ۲۰۰۱ء میں ہمارے دہلی کے دفتر میں اسپر یچول کلاس کے نام سے ہفتے وار اجتماع کا سلسلہ قائم ہوا۔ ان ہفتے وار اجتماعات کے دوران خدا کی غیر معمولی نصرت ظاہر ہوئی۔ چند سال کی مدت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک مضبوط ٹیم تیار ہوگئی۔ ان میں سے ہر شخص دعوتی اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا اور عمل کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتا تھا۔

۲۰۰۵ میں یہ تاریخ یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا چاہیے اس کا عمل بھی خدا کی خصوصی نصرت سے شروع ہو چکا ہے۔ یعنی دعوتِ حق کی اشاعت وتوسیع۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عمل رُکنے والا نہیں۔ خدا کی نصرت اس بات کی ضامن ہے کہ یہ عمل رُکے بغیر مسلسل جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

مذکورہ حدیث پر غور کیجئے تو اس معاملے کا ایک عملی پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ جب مذکورہ تقسیم کے مطابق، ایک ٹیم وجود میں آجائے تو اس کے بعد دعوت کی توسیع واشاعت ایک یقینی امر بن جاتی ہے۔ اس کے بعد ممکن طور پر صرف ایک چیز ہے جو اس عمل کی تکمیل میں رکاوٹ بن سکے، اور وہ حدیث کے الفاظ میں اختلاف کا معاملہ ہے۔ باہمی اختلاف ایسی بُری چیز ہے جو پورے نقشے کو تباہ کرسکتا ہے۔ ٹیم بن جانے کے بعد باہمی اختلاف کے سوا کوئی بھی چیز نہیں جو اس دعوتی سیلاب کو اس کی منزل تک پہنچنے سے روک سکے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ فکر کا اختلاف ایک فطری امر ہے۔ ہر انسانی مجموعے میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد کے درمیان فکری اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ

فکری اختلاف کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ اُس فن کو نہ جانتے ہوں، جس کو ''آرٹ آف ڈفرینس مینیجمنٹ'' کہا جاسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی بھی ٹیم میں رائے کا اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔ البتہ ٹیم کے افراد کو ذہنی طور پر اتنا زیادہ پختہ ہونا چاہیے کہ وہ رائے کے اختلاف اور عملی ٹکراؤ میں فرق کرنا جانیں۔ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر اپنا کام جاری رکھیں۔ رائے کا اختلاف ایک صحت مند علامت ہے۔ کیوں کہ وہ ڈائیلاگ کا سبب بنتا ہے اور ڈائیلاگ فکری ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

الرسالہ مشن کے تحت جو پُر امن دعوت کا کام کرنا ہے وہ بنیادی طور پر اشاعتِ کتب کا کام ہے۔ یہ کام سب سے پہلے انگریزی کتابوں کی اشاعت سے ہوگا۔ کیوں کہ آج دنیا کی آبادی کا ۶۰ فیصد حصہ انگریزی زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ اس کے بعد حالات کے مطابق، یہ کام دوسری زبانوں تک وسیع ہوگا۔ اس اشاعتی کام کے بنیادی طور پر چند اجزاء ہیں:

۱۔ قرآن کا صحیح انگریزی ترجمہ کم قیمت پر ساری دنیا میں پھیلانا (قرآن کا یہ انگریزی ترجمہ خدا کے فضل سے الرسالہ مشن کے تحت زیر تیاری ہے)۔

۲۔ الرسالہ مشن کی مطبوعہ کتابوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا۔ مثلاً: God Arises ، تذکیر القرآن، مطالعہ سیرت، مطالعۂ حدیث، وغیرہ۔

۳۔ چھوٹے چھوٹے دعوتی پمفلٹ، مثلاً ان سرچ آف گاڈ، کریشن پلان آف گاڈ وغیرہ جو کئی درجن کی تعداد میں چھپ چکے ہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا، یہاں تک کہ وہ تمام تعلیم یافتہ انسانوں تک پہنچ جائیں۔

الرسالہ مشن مکمل طور پر ایک غیر سیاسی مشن ہے۔ اس کا مقصد کوئی اقتدار قائم کرنا نہیں ہے بلکہ صرف خدا کے پیغام کو پُر امن انداز میں اور فکری طور پر تمام انسانوں تک پہنچانا ہے اور لوگوں کو خدا کے کریشن پلان سے دلائل کی زبان میں باخبر کرنا ہے۔ تاکہ لوگ حقیقت کو سمجھیں اور صحیح رخ پر اپنے مستقبل کا نقشہ بنائیں۔ دعوت الی اللہ کا یہ فکری مشن خدا کا سب سے زیادہ

مطلوب مشن ہے۔ اس مشن میں خدا کی نصرت ہمیشہ یقینی ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ خدا کی نصرت کا وعدہ اس مشن پر پورا ہوگا۔ اور وہ وقت آئے گا جب کہ تمام انسانوں تک خدا کا وہ پیغام پہنچ جائے گا جس کے پہنچنے کا ساری کائنات کو انتظار ہے۔ دعوت الی اللہ کے کام سے زیادہ بڑا کوئی اور کام نہیں، اور خدا کی مدد حاصل کرنے کے لیے دعوت الی اللہ سے زیادہ اور کوئی یقینی ضمانت نہیں۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں جب کہ خدا کا یہ وعدہ اپنی کامل صورت میں پورا ہو جائے۔

میں نے اپنی کتاب پیغمبر انقلاب میں لکھا تھا کہ اسلام کے دور اول میں جو لوگ توحید کا انقلاب لائے وہ ایسے لوگ تھے جن پر پچھلی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اب دوبارہ اسی طرح ایک نیا عصابۃ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لیے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانے سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔ (صفحہ ۲۰۴)

میری دعا ہے کہ الرسالہ مشن سے وابستہ ہونے والے لوگ اس کا مصداق ثابت ہوں۔

سینٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی

سنٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی نئی دہلی میں جنوری 2001 میں قائم ہوا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کا مقصد امن اور رُوحانیت کو فروغ دینا ہے۔ یہ ایک غیر سیاسی (non-political) آرگنائزیشن ہے۔ اس کا اصل نشانہ فکری انقلاب لانا اور انسان کو حقیقی انسان بنانا ہے۔

اسپریچولٹی اور پیس دونوں گویا ایک حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ فرد میں جس مثبت تھنکنگ کا نام اسپریچولٹی ہے، وہی تھنکنگ جب کلیکٹیو سطح پر پیدا ہو جائے تو اسی کے نتیجے کا نام پیس ہے۔

پیس فُل سوسائٹی تمام بڑی ترقیوں کے لیے ضروری ہے۔ مگر پیس فل سوسائٹی بنانے کا آغاز فرد کے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر سے ہوتا ہے۔ جب اس قسم کے افراد بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں تو اُنھیں کے مجموعے کا نام پیس فُل سوسائٹی ہے۔

اسپریچولٹی کو روایتی طور پر ایک ایسا ڈسپلن سمجھا جاتا ہے جو opposed to worldliness ہے۔ یعنی زندگی کو مادّیات سے اوپر اٹھانا اور اپنے آپ کو روح (soul) کی سطح پر لے جانا۔ روحانیت کے اس تصور کی بنا پر قدیم زمانے میں ایسا ہوا کہ لوگوں نے رہبانیت کو روحانیت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا۔ یعنی مادّی دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جانا اور تمدنی ماحول سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارنا۔

جب آدمی اس طرح کی غیر مادّی زندگی کی طرف اپنے آپ کو لے جاتا ہے اور وہ اس میں اپنے آپ کو بہت زیادہ مشغول کرتا ہے تو اس کو داخلی طور پر ایک مجہول فیلنگ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فیلنگ وہی ہے جس کو عام طور پر وَجد (Ecstasy) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ وجد مطلوب روحانیت نہیں۔ یہ وجد دراصل روحانیت کی ایک کمتر صورت (reduced form) ہے، وہ اصل روحانیت نہیں۔

انسان کی سب سے بڑی فیکلٹی اس کا دماغ ہے۔ اسی لیے انسان کو ''تھنکنگ انیمل'' کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں حقیقی روحانیت وہ ہے جو مائنڈ یا تھنکنگ کی سطح پر حاصل ہو۔ جب کہ وجد کا حصول

تھنکنگ کی سطح پر نہیں ہوتا۔ وہ ایک قسم کا تخدیر (psychological anesthesia) ہے۔ وہ شعوری سطح پر حاصل ہونے والی چیز نہیں۔

روحانیت معروف تصور کے مطابق، heart based ڈسپلن نہیں، بلکہ وہ mind based ڈسپلن ہے۔ انسان کا قلب صرف خون کی گردش کا ایک آلہ ہے، وہ تفکیری عمل کا مرکز نہیں۔ اس لیے حقیقی روحانیت وہ ہے جو دماغ کے شعوری عمل کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

روحانیت (spirituality) مذہب سے الگ کوئی چیز نہیں۔ روحانیت دراصل مذہب کی اصل اسپرٹ کا نام ہے۔ مذہب کا لفظ عام طور پر فارم یا رسوم (rituals) سے جڑ گیا ہے۔ مگر فارم یا رسوم مذہب کی صرف ایک ظاہری صورت ہے۔ جہاں تک مذہب کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ عین وہی چیز ہے جس کو روحانیت (spirituality) کہا جاتا ہے۔

روحانیت یا (spirituality) دراصل یہ ہے کہ آدمی حقیقت اعلیٰ کی معرفت حاصل کرلے۔ وہ مادی یا حیوانی سطح سے اوپر اٹھ جائے۔ وہ ادنیٰ انسانی سطح سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ انسانی سطح پر جینے والا بن جائے۔

روحانیت مادّی دنیا کو چھوڑنے کا نام نہیں، بلکہ روحانیت یہ ہے کہ آدمی مادّی دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ مادّی واقعات کو روحانی تجربات میں کنورٹ کرتا رہے۔ وہ غیر روحانیت کو روحانیت میں کنورٹ کر رہا ہو جس طرح ایک گائے non-milk کو milk میں کنورٹ کرتی ہے۔

کنورژن کا یہ معاملہ شعوری بیداری کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب ایک عورت یا مرد کا شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہو تو ایسے لوگ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ مادّی چیزوں کو اپنے لیے روحانی غذا بنا سکیں — سینٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی کا مقصد اسی قسم کے اعلیٰ مائنڈ کو تیار کرنا ہے۔

اسپریچولٹی کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ اسپریچولٹی کا سورس آدمی کے خود اپنے اندر ہے — اپنے اندر جھانکو اور اسپریچولٹی کو پا جاؤ۔ مگر سی۔ پی۔ ایس کا ماننا ہے کہ انسان صرف recipient ہے۔ دینے والا صرف خدا ہے۔ سی۔ پی۔ ایس کے مطابق، اسپریچولٹی کو حاصل کرنے کا ذریعہ اپنی

خداشناس فطرت کو جگانا، تخلیق میں غور کر کے خالق کو پانا، ''سمپل لِونگ اور ہائی تھنکنگ'' کے اصول کو اختیار کر کے اپنی ہستی کے روحانی پہلو کو ترقی دینا ہے۔

روحانیت یا اسپریچولٹی کے بیک وقت دو فائدے ہیں۔ ایک، فرد کی مثبت تعمیر اور دوسرے، صحت مند سماج کو ظہور میں لانا۔ روحانیت آدمی کے اندر وہ چیز پیدا کرتی ہے جس کو simple living, high thinking کہا جاتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ غیر متعلق دل چسپیوں سے اوپر اُٹھ کر اپنی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر کر سکے۔ اس طرح سماجی سطح پر اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگ اس قابل ہوجاتے ہیں کہ وہ تمام مادّی مفادات کو سکنڈری بنائیں اور اعلیٰ انسانی مفادات کو اصل حیثیت دیں۔ جس سوسائٹی کے افراد میں یہ صفت پیدا ہوجائے، اس کے بعد اُس سوسائٹی میں جو اجتماعی حالات پیدا ہوتے ہیں اسی کا نام پیس ہے۔

سینٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی کے عمل کا دائرہ کوئی محدود دائرہ نہیں۔ اس کے تحت ہر اُس پیس فل متھڈ کو اختیار کیا جاتا ہے جو اس مقصد کے حصول میں مددگار ہو۔ مثلاً ملاقاتیں، میگزین اور لٹریچر کی اشاعت، ہفتے وار اور ماہوار پبلک پروگرام، روحانی اصول پر نوجوانوں کی تربیت، ماڈرن ایڈیم میں جدید ذہن کو روحانیت کی اہمیت پر مطمئن کرنا، وغیرہ۔ سینٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی یہ کام ملک کے اندر بھی انجام دے رہا ہے اور ملک کے باہر بھی۔